

# پرچم اُڑتا رہا

جذبہ حریت پر مبنی سچی تاریخی داستانوں کا مجموعہ



## جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

## فہرست

۷	لوطیہ	سُرنگ جو روضہ مبارک کو لگائی گئی
۱۵	طاس	سید کا بھیل
۳۹	ڈاکٹر صادق حسین	بالاکوٹ کے میدان جنگ میں
۵۳	ابن صحرا	حسین ناگن
۶۹	ابرار علی سید	خنجر جودل میں اتر گیا
۸۹	لیفٹیننٹ کرنل مختار احمد گیلانی	پدمنی اور علاؤ الدین خلجی
۹۷	مہدی حسن پراچہ	مرتے باپ کی بددعا
۱۰۹	زیر اسد/محمد علی چوہان	مارکونی اور مادر وطن
۱۲۷	علی عباس	تیسرا آدمی
۱۳۵	مبشر شرف الدین	انگریز انسان اور گدھا
۱۳۵	ارشاد بیگ	نور عنایت خان
۱۶۷	ابن صحرا	وہ ترکوں کے خلاف نہ لڑے
۱۷۷	جان گڈون/خواجہ نذیر الدین	پرچم اڑتا رہا
۱۸۵	مبشر جنرل محمد اکبر خان (رنگروٹ) مرحوم	ترکوں کی قید سے میرا فرار
۲۰۱	مبشر جنرل محمد اکبر خان (رنگروٹ) مرحوم	جب ہم نے دہشت پسندوں کو پکڑا

نام کتاب	پرچم اڑتا رہا
مصنف	عنایت اللہ
ناشر	گل فراز احمد
مطبع	علم و عرفان پبلشرز، لاہور
سن اشاعت	زائدہ نوید پرنٹرز، لاہور
قیمت	مارچ 2009ء
	170 روپے

☆ ملنے کے پتے ☆

علم و عرفان پبلشرز

40- اردو بازار، الحمد مارکیٹ، لاہور

فون: 7352332-7232336

سیونٹھ سکاٹی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40- اردو بازار، لاہور

فون: 7223584، موبائل 4125230-0300

حکایت پبلشرز

26- پیالہ گراؤنڈ لنک میکلڈ روڈ لاہور- 7356541-7321896

## پیش لفظ

تاریخ کی یہ پندرہ کمائیاں افسانے نہیں ہر کمائی حقیقی ہے اور ثابت کرتی ہے کہ حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔

ان میں دو کمائیاں سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین کے جہاد کی ہیں۔ سید کا سبب "خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ مسلمانوں اور سکھوں کے ایک معرکے کی اور ایک مجاہد کی غیر معمولی شجاعت کی ایمان افروز کمائی ہے۔" بالاکوٹ کے میدان جنگ میں "بھی مسلمانوں اور سکھوں کے ایک اور، بلکہ آخری، معرکے کی روئیداد ہے۔ اس میں ایک تو بدر کے میدان کی روایت ملتی ہے، دوسرے اس میں ایمان فروشوں کی غداری بھی شامل ہے جو مجاہدین کی شکست اور سید احمد شہید کی شہادت کا باعث بنی۔ اس غداری کے نتائج اتنے دور رس تھے کہ بڑے صغیر کے مسلمان انگریزوں کی غلامی میں جکڑے گئے۔

دو کمائیاں الجزائر کی جنگ آزادی کی ہیں جو مسلمانوں نے دس سال فرانسیسی استبداد کے خلاف لڑی تھی۔ یہ دو چار کرداروں کی انفرادی کمائیاں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ الجزائر کے مسلمان کس جذبے سے لڑے تھے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں ترکی نے پاکستان کی بہت

مدد کی تھی۔ یہاں تک کہ ترکی کی اُس وقت کی حکومت بھارت کے خلاف اعلان جنگ کرنے کو تیار ہو گئی تھی۔ پاکستان کے ساتھ ترکی کی اس محبت کا ایک پس منظر ہے جس میں اسلام کا رشتہ کارفرما ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں کی ہندوستانی فوج کے مسلمانوں نے عراق کے محاذ پر ترکوں کے خلاف لڑنے

سے انکار کر دیا تھا۔ اس سلسلے کی دو کمائیاں خاص طور پر اس مجموعے میں شامل کی گئی تھیں۔  
 ”پرچم اڑتا رہا“ ترکوں کے جذبہ حب الوطنی کی بڑی ہی عجیب کمائی ہے۔  
 صرف دو ترکوں نے ایک پوری قوم کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ اس  
 وقت یہ دونوں ترک ترکی میں نہیں آسٹریلیا میں تھے۔ اُدھر یورپ میں پہلی  
 جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ آسٹریلیا انگریزوں کے زیر نگیں تھا۔ اس ملک میں یہی دو  
 ترک تھے۔ انہوں نے وہاں اپنا مورچہ بنالیا اور فائرنگ شروع کر دی۔ انہوں  
 نے یہ جنگ کس طرح لڑی اور اس کا انجام کیا ہوا؟ اس کمائی میں پڑھیے۔  
 دو کمائیاں پاکستان کے پہلے میجر جنرل محمد اکبر خان (رنگر دھڑ) مرحوم نے  
 منائی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں وہ ترکوں کے جنگی قیدی بن گئے اور وہ قید سے  
 فرار ہو آئے تھے۔ اس کمائی میں بھی دلچسپی کا مواد خاصا ہے اور اس میں جذبہ بھی ہے۔  
 متفرق کمائیاں بھی اس مجموعے میں شامل ہیں۔

اگر آپ اپنے بچوں کو ایسی کمائیاں پڑھانا چاہتے ہیں جن میں کمائیوں جیسی  
 دلچسپی ہو اور جو بچوں میں جذبہ بھی پیدا کریں تو انہیں یہ مجموعہ پڑھائیں۔  
 عنایت اللہ  
 مدیر ماہنامہ ”حکایت“ لاہور

## سُمرنگ جو روضہ مبارک کو لگائی گئی

سلطان صلاح الدین الیوتی کے دور کی کمائیوں ”داستان ایمان فروشوں  
 کی“ میں آپ نے سلطان نور الدین زنگی کے متعلق بہت کچھ پڑھا ہوگا۔ نور الدین  
 زنگی صلیبیوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اسی نے صلاح الدین الیوتی کو اس راہ  
 پر ڈالا تھا کہ صلیبیوں کو عالم اسلام سے نکال کر اسلام کو یورپ کے قلب تک  
 پہنچانا ہے۔ نور الدین زنگی کا اپنا بھی یہی مشن رہا۔ اسے ناکام کرنے کے لئے  
 صلیبیوں نے عالم اسلام میں سازشوں، تخریب کاری اور مسلمانوں کی کردار کشی  
 کے دل کش حربوں کا جال بچھا دیا تھا۔ اس کی تفصیلات ”داستان ایمان فروشوں  
 کی“ میں پیش کی جا چکی ہیں۔

ان سازشوں میں ایک بڑی ہی بھیانک تھی۔ صلیبیوں نے رسول اکرم  
 صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد مبارک روضہ مبارک سے نکال لے جانے کی کوشش  
 کی تھی جو نور الدین زنگی نے پھٹی۔

نور الدین زنگی کو سلطان عادل نور الدین زنگی بھی کہا جاتا ہے۔ اسلام  
 کا یہ عظیم پاسبان حشیش (حسن بن صالح کے فدائی قاتلوں) کے ہاتھوں اس  
 طرح شہید ہوا تھا کہ اُسے کھانے میں زہر دے دیا گیا تھا۔ اس کے اثر سے زنگی  
 کے گلے میں سوزش ہوتی جس کا علاج کوئی طبیب نہ کر سکا۔ چند دنوں میں ہی نور الدین  
 زنگی اللہ کو ہیارا ہو گیا۔ سب اسے گلے کا کوئی مرض سمجھتے رہے۔ یہ انکشاف  
 بہت بعد میں ہوا تھا کہ اُسے صلیبیوں نے فدا تیوں کے ہاتھوں زہر دلو کر قتل



طرف سے صلیبیوں کی نئی یلغار آرہی ہے اور وہ گھر میں بیٹھا ہے۔ اُس نے ہر اُس طرف جاسوس دوڑا دیتے جہاں سے صلیبیوں کے حملے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ تیسری رات بھی اُس نے یہی خواب دیکھا تو اُس نے اپنے وزیر جمال الدین موصلی کو بلایا اور اُسے یہ خواب سنایا۔ جمال الدین موصلی دانشمند انسان تھا۔ وہ گہری سوچ میں گھوٹا، پھر لولا کہ اشارہ معمولی نہیں۔ اسے محض خواب یا خیال نہیں کہا جاسکتا۔

”آپ یہ خواب کسی اور سے بیان نہ کریں۔“ وزیر نے مشورہ دیا۔  
 ”اور فوری طور پر مدینہ منورہ کو روانہ ہونے کی تیاری کریں۔ روضہ مبارک کی زیارت سے شاید حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ پوری طرح واضح ہو جاتے۔“  
 سلطان نور الدین زنگی مضطرب تھا۔ اس خواب کو نظر انداز کرنے کی اُس میں جرات نہیں تھی۔ اُس نے رخت سفر باندھا۔ بیشمار مال و دولت بغرض خیرات ساتھ لیا اور عازم مدینہ منورہ ہوا۔ وزیر جمال الدین موصلی کو اور بیس محافظوں کو بھی ساتھ لے لیا۔ سولہ دنوں کی مسافت نے اُسے مدینہ منورہ پہنچا دیا۔ اُس نے شہر سے باہر روضہ اور غسل کیا تاکہ اس مقدس شہر میں پاک جسم سے داخل ہو۔ روضہ مبارک کی زیارت کی۔ عقیدت مندی کا یہ عالم کہ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ رورور التجا کی۔ ”یا رسول اللہ آپ کیوں اُداس ہیں؟ .... یا رسول اللہ مجھے اشارہ دیں کہ آپ کے چہرہ مبارک پر مسکواہٹ لانے کے لئے میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کروں۔“

اسی عالم میں اُس نے نماز پڑھی۔ اتنے میں مسجد میں نمازی آگئے۔ نماز کے بعد وزیر جمال الدین موصلی نے اعلان کیا کہ نور الدین محمود زنگی سلطان شام روضہ مبارک کی زیارت کے لئے تشریف لاتے ہیں اور اہل مدینہ کے لئے کچھ ذرا نقد لاتے ہیں۔ مدینہ منورہ کے تمام باشندوں کو مسجد کے باہر آئے کو کہا جاتے کہ ہر ایک کا حصہ سلطان اپنے ہاتھوں ہر ایک کو دے دیں۔ شہر کی آبادی آج کی طرح اتنی زیادہ نہیں تھی۔ شہر میں اعلان ہوا اور لوگ آنے لگے۔ سلطان زنگی ہر ایک کو کچھ رقم دیتے ہوئے اُس کے چہرے کو

کراہتا تھا۔ اسی لئے اُسے نور الدین زنگی شہید کہا جاتا ہے۔ اس کا پورا نام الملك العادل نور الدین محمود زنگی تھا۔ ۱۱۸۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۲۱۶ء میں وفات پائی۔

سلطان زنگی کی وفات سے بارہ سال پہلے ۱۱۶۲ء (۵۵۵ ہجری) کا واقعہ ہے۔ سلطان کو جب میدان جنگ سے کچھ دنوں کی ہجرت ملتی تھی تو وہ راتوں کو کوئی نہ کوئی وظیفہ پڑھا کرتا تھا اور تنجد کی بھی پابندی کرتا تھا۔ ایک رات سلطان زنگی تنجد پڑھ کر سو گیا۔ اس سے پہلے وہ ایک وظیفہ پڑھتا رہا تھا۔ اُس نے خواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپ کے دائیں اور بائیں دو آدمی کھڑے تھے جن کے چہروں کے رنگ سرخ و سپید تھے۔ وہ عرب کی سربزین کے آدمی معلوم نہیں ہوتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر اُداسی بھی تھی اور غصے کا تاثر بھی تھا۔ آپ نے ان دو آدمیوں کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا۔ آپ کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اشارہ اتنا واضح تھا کہ سلطان زنگی سمجھ گیا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ ان سرخ و سپید چہروں کو پہچان اور مجھے ان سے بھا

سلطان زنگی کی آنکھ کھل گئی۔ جسم پسینے سے شرابور اور دل پر مقدس سا خوف تھا۔ سلطان نے ذہن پر زور دیا کہ یہ اشارہ کیا تھا۔ اُسے یہ تو یقین ہو گیا کہ یہ دو آدمی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں کھڑے تھے، صلیبی تھے۔ اس سے سلطان زنگی نے یہ تعبیر اخذ کی کہ رسول اکرم نے حکم دیا ہے کہ اسلام اور عالم اسلام کو کفار سے بچا۔ یہی سلطان کی زہر کی کاوش تھا۔ اس خواب نے اُس کی حوصلہ افزائی کر دی اور وہ مطمئن ہو گیا۔

اگلی رات اُس نے پھر یہی خواب دیکھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہی دو آدمیوں کے درمیان کھڑے ہیں جن کے چہرے سرخ و سپید ہیں۔ اب کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور زیادہ واضح اشارہ کر رہے تھے کہ مجھے ان سے بچا۔ سلطان زنگی کی آنکھ کھلی تو دل پر خوف اور ذہن میں الجھن تھی۔ وہ سمجھا کہ کسی

11

غور سے دیکھتا۔ اُسے کوئی چہرہ سرخ و سپید نظر نہیں آ رہا تھا۔ خواب والے دونوں چہرے اُس کے ذہن میں نقش ہو گئے تھے۔ تمام آدمی اپنا اپنا حصہ لے کر چلے گئے تو سلطان زنگی نے معززین شہر سے پوچھا کہ کوئی رہ گیا ہے؟ ”وہی رہ گئے ہوں گے جو کسی کام سے شہر سے باہر چلے گئے ہیں۔“ سلطان کو جواب ملا۔ ”دو آدمی ایسے ہیں جو اپنا حصہ لینے نہیں آتے کیونکہ وہ خود متمول ہیں۔ اکثر خیرات دیتے رہتے ہیں۔ انہوں نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔“

”کیا وہ یہاں کے رہنے والے ہیں؟“ سلطان نے پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ اُسے جواب ملا۔ ”مغرب کے کسی ملک سے آئے ہیں۔ اپنے گھر میں عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ روضہ مبارک کی زیارت کے لئے آتے ہوئے ہیں۔“

سلطان نور الدین زنگی خود بھی دانشمند تھا اور اُس کی نگاہ بہت دور تک دیکھ سکتی تھی۔ اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس نے اپنی روح میں بسا رکھا تھا اور وہی روشنی اُس کے آگے اندھیرے پر دے چاک کر دیا کرتی تھی۔ اُس نے جب سنا کہ یہ دو آدمی جو اُس کے سامنے نہیں آتے وہ مغرب سے آتے ہیں اور گھر میں عبادت کرتے ہیں تو اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ صلیبیوں اور یہودیوں کی سازشوں سے آگاہ تھا۔ اُس نے شک رفع کرنے کے لئے کہا کہ ان دونوں سے کہو کہ اپنا حصہ نہ لیں، یہاں آتو جاتیں۔ میں بھی ان کی طرح یہاں اجنبی ہوں۔ ان دونوں کو مجبوراً آنا پڑا۔ سلطان نور الدین زنگی یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ دونوں خواب والے چہرے تھے۔ سرخ و سپید چہرے کا ہر ایک نقش وہی تھا اور وہی قد بت تھے۔ یہ دونوں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں اور بائیں کھڑے تھے اور ان کے درمیان رسول خدا اُداس نظر آتے تھے۔

”تم دونوں یہاں کیوں آتے ہو؟“ سلطان نے پوچھا۔  
 ”ہم دیارِ مغرب سے حج کے لئے آتے ہیں۔“ ایک نے جواب دیا۔

12

— مہر سال روضہ مبارک کے مجاورین کر گزاریں گے، پھر چلے جاتیں گے۔“ سلطان زنگی ان کے قریب چلا گیا اور بیٹھی دھیمی آواز میں بولا۔ ”اگر تم سب بتا دو کہ تم کون ہو تو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔“

دونوں اپنی بات پر نہ صرف قائم رہے بلکہ انہوں نے غصے کا اظہار کیا کہ اُن پر شک کیا جا رہا ہے۔ سلطان نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کہاں رہتے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ حجرہ شریف (جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جدِ مبارک دفن ہے) کے قریب رہتے ہیں۔ سلطان زنگی نے اپنے محافظوں سے کہا کہ ان دونوں کو ان کے گھر لے چلو۔ دونوں نے بہت احتجاج کیا۔ بہت غل بپا کیا لیکن شام کے سلطان کو کوئی روک نہ سکا۔ ان کے گھر جا کر دیکھا۔ دو قرآن پاک پڑے تھے۔ چند مذہبی کتابیں تھیں جو علمائے اسلام کی لکھی ہوئی تھیں۔ تسبیحیں تھیں اور فرش پر ایک جگہ ایک چٹائی بچھی تھی جس پر مصطفیٰ رکھا تھا۔ سلطان کو وہاں کوئی مشکوک چیز نظر نہ آتی۔

سلطان خاموش اور پریشان ہو گیا۔ تب لوگوں نے کہا کہ ان دونوں پر کسی قسم کا شک نہ کیا جائے۔ یہ دونوں خیرات کرنے والے سخی اور پارسا ہیں۔ روضہ مبارک کی مجاوری کرتے اور ہر صبح جنت البقیع کی زیارت کرتے ہیں۔ ہر کوئی ان کا احترام کرتا ہے۔ سلطان زنگی نے بظاہر ایسا رویہ اختیار کر لیا جیسے اُس کا شک رفع ہو گیا ہو اور اُسے افسوس ہو کہ اُس نے دو پارساؤں کی توہین کی ہے لیکن یہ سوال اُسے پریشان کئے ہوئے تھا کہ تین بار اس نے ایک ہی خواب دیکھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں کے درمیان اُداس کھڑے دیکھا اور آپ کا اشارہ بڑا صاف تھا کہ مجھے ان سے بچاؤ۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ رسول خدا نے ایک ناچیز بندے سے کیوں مدد مانگی ہے؟

یہ دونوں غیر ملکی تھے۔ ایسے کئی تخریب کار صلیبی اور یہودی پکڑے بھی گئے تھے جو علمائے اسلام اور اماموں کے بھیس میں اسلام کی ہی تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ سلطان فرش پر کچھی ہوئی چٹائی پر چلنے پھرنے لگا۔ اس نے

اور بے دریغ خیرات اور صدقہ دیتے رہیں اور کسی قریبی مکان میں رہ کر حجرہ مبارک تک سرنگ کھود کر پہنچیں اور جسد مبارک نکال کر لے آئیں۔ یہ دونوں سرنگ کھودتے رہتے تھے اور سرنگ کی مٹی رات کو قبرستان میں بکھر آتے تھے۔ انہوں نے چمڑے کی وہ بڑی بڑی تھیلیاں بھی دکھائیں جن میں وہ مٹی بھر کر باہر لے جایا کرتے تھے۔ وہ کئی مہینوں سے آہستہ آہستہ سرنگ کھود رہے تھے تاکہ ایک ہی بار مٹی زیادہ جمع نہ ہو جاتے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ اتنے خوفزدہ ہو گئے تھے کہ وہ سوچ میں پڑ گئے تھے کہ سرنگ کو آخر تک پہنچائیں یا یہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ وجہ یہ ہوتی تھی کہ جب سرنگ حجرہ مبارک کے اتنی قریب پہنچ گئی کہ صرف ایک دن کی کھدائی باقی تھی تو آسمان سیاہ گھٹاؤں میں چھپ گیا۔ بجلی کی چمک اور کڑک اتنی زیادہ تھی کہ زمین ہلتی تھی۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ زلزلہ آیا ہے۔ رعد اور باد و باران کا ایسا طوفان آیا جو اس خطے میں کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ دونوں رُک گئے اور سرنگ کو آگے نہ کھودا۔ اتنے میں سلطان نور الدین زنگی رسول خدا کے اشارے پر آن پہنچا۔

سلطان نور الدین زنگی اس سعادت پر زار و قطار رویا اور حجرہ شریف کی دہلیز کو تادیر چومتا رہا کہ رسول خدا نے یہ عظیم نیکی اس کے ہاتھوں کرائی ہے۔ اُس نے ان دونوں صلیبیوں کو روضہ مبارک کی دہلیز پر ہلاک کر لیا اور ان کی لاشیں شہر سے باہر پھینکوا دیں تاکہ انہیں کُتے اور گرہ کھالیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ان کی لاشیں جلادی گئی تھیں۔ اس کے بعد سلطان نے روضہ مبارک کے ارد گرد اتنی گہری خندق کھدوائی جو حجرہ مبارک کی گہرائی سے بھی نیچے چلی گئی۔ اس خندق میں اُس نے بڑے بڑے پتھر ڈلو اتے جو اہل مدینہ کندھوں پر اٹھا کر لاتے تھے۔ پھر بے اندازہ سیسہ جست اور تانبا منگو کر انہیں پگھلایا اور خندق میں ڈال دیا جو بڑے پتھروں کے درمیان چلا گیا۔ اس سے خندق بھر گئی۔ اسے اوپر سے زمین کے ساتھ سموار کر دیا گیا۔ پتھروں اور پگھلی ہوتی دھاتوں نے حجرہ مبارک کے گرد ایسی مضبوط زمین دوز دیوار بنا دی جسے

جوتے اُتار دیتے تھے۔ بظاہر بے مقصد ٹپٹے ٹپٹے وہ مصیبت پر جاکھڑا ہوا۔ اُس نے محسوس کیا کہ مصیبت کے نیچے فرش میں سختی نہیں بلکہ لچک سی ہے۔ اُس نے اپنے محافظوں سے کہا کہ یہ چٹائی اور مصیبت اٹھا دو۔

دونوں چیریں ہٹا دی گئیں تو جہاں مصیبت تھا وہاں لکڑی کا ایک ستونہ رکھا تھا اور اس کے ارد گرد کچی مٹی تھی جسے یہاں سے جگہ کھودی گئی ہو سلطان زنگی نے اپنے ہاتھوں تختہ اٹھایا۔ اس کے نیچے ایک گڑھا تھا جس کی تہہ نہیں تھی بلکہ یہ ایک طرف کو ٹھوم گیا تھا۔ یہ سرنگ تھی۔

سلطان زنگی نے ایک محافظ سے کہا کہ وہ سرنگ کے اندر جا کر دیکھے کہ کس طرف اور کہاں تک جاتی ہے۔ محافظ کو رہنما کر اندر جانا پڑا۔ اُس نے باہر آکر بتایا کہ سرنگ کتنی لمبی ہے اور کس سمت کو جاتی ہے۔ سرنگ حجرہ مبارک کی سمت جاتی تھی جہاں رسول کریم کا جسد مبارک دفن ہے اور سرنگ کی لمبائی اتنی تھی کہ حجرہ مبارک تک پہنچنے والی تھی۔

سلطان زنگی نے دونوں سے کہا کہ وہ اذیت ناک تشدد سے بچیں اور بتا دیں کہ یہ سب کیا ہے۔ انہوں نے پس و پیش کی تو محافظوں نے سلطان کے اشارے سے انہیں زد و کوب کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے لوگ بھی ان کی مار پٹائی کرنے لگے تھے۔ سلطان نے انہیں چھڑا کر کہا کہ انہیں مرنے نہیں دیا جائے گا اور وہ مسلسل اذیت میں رہیں گے۔ اب جب کہ ان کی کارستانی ظاہر ہو چکی ہے تو وہ اپنی ہڈیاں تڑوانے سے بچیں۔

انہوں نے بتا دیا کہ وہ دونوں عیسائی ہیں اور یہ منصوبہ عیسائیوں اور یہودیوں نے مل کر بنایا ہے کہ رسول خدا کے جسد مبارک کو نکال کر اس کی سرعام توہین کی جائے اور مسلمانوں کو دکھایا جائے کہ دیکھو اپنا رسول، یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مختصر یہ کہ کفار رسول خدا کے جسد مبارک کو اپنے عزائم کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ان دو آدمیوں کو پارسا مسلمان زائرین کے جیس میں بے انداز مال و دولت دے کر مدینہ منورہ بھیجا تھا کہ لوگوں پر پارسائی، ریاضت اور روضہ مبارک کی مجاورت کا تاثر پیدا کریں

کوئی ہتھیار کاٹ نہیں سکتا۔

بہت بعد کے دور کے بادشاہوں نے روضہ مبارک کو موجودہ شکل دی۔ سلطان نور الدین زنگی کی زمین دوز گول دیوار ابھی تک زمین کے نیچے موجود ہے۔ علامہ جمال الدین محمد مطری (وفات ۱۴۱۷ھ) نے بھی یہ واقعہ لکھا ہے۔ انہوں نے یہ واقعہ فقیہ علم الدین یعقوب بن ابی بکر سے جن کے والد محترم مسجد نبوی کی آتش زدگی میں جلیں کر وفات پا گئے تھے، سنا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ دو صلیبی اُنڈلس سے آئے تھے۔

## سید کا سچلا

یکم دسمبر ۱۸۳۶ء کی شام ابھی گہری نہیں ہوئی تھی سلطنت مغلیہ کا سوچ بچی کا ڈوب چکا تھا۔ قلعے جو مغلوں نے تعمیر کیے تھے وہ اُن کے مقبروں کی طرح اُداس اور خاموش تھے۔ ان میں ایک قلعہ لاہور تھا جسے شاہی قلعہ کہتے ہیں۔ اب یہ قلعہ سکھوں کے قبضے میں تھا۔ اس کا قلعہ دار اُدھم سنگھ قلعے کے اندر روزمرہ معمول کے مطابق ٹہل رہا تھا۔ دو محافظ اُس کے ساتھ تھے۔ ایک سکھ دوڑتا آ رہا تھا۔ محافظوں نے آگے ہو کر اُسے روک لیا کہ وہ قلعہ دار کی طرف کیوں دوڑا آ رہا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ قلعے کا قاصد ہے۔

”آنے دو اسے“۔ قلعہ دار اُدھم سنگھ نے حکم دیا۔ ادھر آوئے....

کیوں آئے ہو؟

”ایک مسلمان کو کپڑا ہے مہاراج!“۔ قاصد نے آکر کہا۔ ”وہ کتا ہے میں اسلامی فوج کا قاصد ہوں اور مہاراجہ کے لیے پیغام لایا ہوں۔ آپ کی اجازت کے بغیر اُسے مہاراجہ کے سامنے نہیں لے جایا جاسکتا تھا۔“

”اسلامی فوج؟“۔ اُدھم سنگھ نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ”کون

سی اسلامی فوج؟.... اوہ.... یہ لپٹاؤر کے پٹھان خواتین کا قاصد ہوگا۔“

اُس نے رعزت سے کہا۔ ”اُن کے قاصد کو گرفتار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ صلح کا پیغام لایا ہوگا۔ ایسے کمزور لوگوں کے قاصد سے ڈرکیسا!.... چلو میں آتا ہوں۔“



کے مہاراجہ کو قتل کرنے نہیں آیا۔ انہیں پیغام دینے آیا ہوں۔“  
 ”کیا پیغام دوستی کا ہے؟“ اودھ سنگھ نے پوچھا۔ ”مسلمان  
 اب دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔“

”اس کا انحصار مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جواب پر ہے۔“ ہرٹخان  
 نے کہا۔ ”لیکن مجھے زیادہ بات کرنے کا حکم نہیں۔ مجھے صرف پیغام دینا ہے۔“  
 ”تم آج رات ہمارے مہمان ہو گے۔“ اودھ سنگھ نے کہا۔ ”کل تین  
 مہاراجہ کے سامنے لے جایا جائے گا۔“ اُس نے جتھے دار کا بن سنگھ  
 سے کہا۔ ”اسے مہمان خانے پہنچا دو اور خیال رکھو کہ اس کے ساتھ  
 کوئی بدتمیزی نہ ہو۔ اس کی تلوار اس کے پاس رہے گی۔“

اودھ سنگھ بہت خات کو مہمان خانے بھجوا کر رنجیت سنگھ کے پاس  
 چلا گیا۔ اُس وقت رنجیت سنگھ کوئی سنجیدہ بات سننے اور سمجھنے کی نیت  
 میں نہیں تھا۔ اُس کے سامنے شراب رکھی تھی اور تین چار درباری نے نوشی  
 میں اُس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اودھ سنگھ کو دیکھ کر اُس نے بازو پھیلا  
 کر کہا۔ ”ہمارا قلعہ دار بھی آگیا ہے۔“  
 اودھ سنگھ بیٹھ گیا مگر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ اُس نے تہمت  
 نہ لگایا۔

”مہاراجہ جی!“ اُس نے رنجیت سنگھ سے کہا۔ ”کیا یہ تید احمد  
 وہی ہے جس کا آپ نے اُس روز ذکر کیا تھا؟ آپ نے کہا تھا کہ تید احمد  
 ہندوستان کا رہنے والا ہے اور اب قندھار سے پشتا در پہنچا ہے۔ آپ  
 نے بتایا تھا کہ وہ کوئی عالم نہیں جادوگر ہے۔ جدھر جاتا ہے وہاں کے  
 مسلمان اُس کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور اُس کی فوج میں شامل ہو جاتے ہیں۔“  
 ”کیا یہ بات کرنے کا تمہیں یہی وقت ملا تھا اودھ سنگھ؟“ مہاراجہ  
 رنجیت سنگھ نے کہا۔ ”تم نے کوئی نئی بات تو نہیں سن لی؟ ہم تید احمد کو  
 اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس وقت اُس کا ذکر کریں۔“  
 ”نئی بات یہ ہے مہاراجہ جی!“ اودھ سنگھ نے کہا۔ ”کہ اُس

وہ اُس جگہ پہنچا جہاں سکھ سپاہیوں نے ایک مسلمان کو گرفتار کر رکھا  
 تھا۔ کم دیش بیس سکھ تلواریں سونٹے ایک جوان سال مسلمان کو گھیرے میں  
 لیے ہوئے تھے۔ قلعہ دار اودھ سنگھ کو دیکھ کر انہوں نے گھیرا کھلا کر دیا۔ اودھ سنگھ  
 نے دیکھا کہ بیس بائیس سال عمر کا ایک مسلمان جس کی رنگت گوری تھی، کھڑا مسکرا  
 رہا تھا۔ اُس کی تلوار اُس کی نیام میں تھی۔ اودھ سنگھ کے چہرے پر خفت کا تاثر  
 آگیا۔ اُس نے جتھے دار کا بن سنگھ کی طرف غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔  
 ”مہاراجہ!“ کا بن سنگھ نے قلعہ دار کی آنکھوں میں غصہ اور سوال  
 بھانپ کر کہا۔ ”یہ مہاراجہ سے ملنا چاہتا ہے مگر اپنی تلوار ہمارے حوالے  
 نہیں کرتا۔“

”کیا نام ہے تمہارا؟“ اودھ سنگھ نے اس جوان سال مسلمان سے  
 پوچھا۔ ”کہاں سے آئے ہو؟“

”میرا نام بہت خان ہے۔“ مسلمان نے جواب دیا۔ ”میں اپنے  
 سالار اعلیٰ سید احمد کا پیغام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام لے کر آیا ہوں۔“  
 ”اوہ، سید احمد۔“ اودھ سنگھ نے بے نیازی سے کہا جیسے تید احمد  
 کو وہ کچھ سمجھتا ہی نہ ہو۔ اُس نے کہا۔ ”کیا وہ چند ایک آدمیوں کو ساتھ  
 لے کر سالار اعلیٰ بن گیا ہے؟“

”وہ کچھ بھی ہے، میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام ان کا پیغام لایا  
 ہوں۔ بہت خان نے کہا اور اپنے گرد آنکھوں کے گھیرے کو دیکھ کر بولا۔  
 ”آپ کا کوئی حیر آدمی بھی ہمارے ہاں آجائے تو ہم اُس کے ساتھ یہ سلوک  
 نہیں کریں گے جو میرے ساتھ ہو رہا ہے۔“

”یہ قلعہ ہے تو جوان!“ اودھ سنگھ نے کہا۔ ”ہمارے کچھ  
 قاعدے قانون ہیں۔ ہم نہیں مہاراجہ سے ملوادیں گے لیکن تمہیں اپنی تلوار  
 ہمارے حوالے کرنی پڑے گی۔“

”کچھ قاعدے قانون ہمارے بھی ہیں۔“ بہت خان نے کہا۔  
 ”ہمارا مذہب ہتھیار دشمن کے حوالے کرنے کو گناہ کہتا ہے۔ میں آپ

کا قاصد کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔ قاصد کہتا ہے کہ وہ اپنی تلوار سمیت آپ کے سامنے آئے گا۔

”کیا تم مسلمانوں کی صرف ایک تلوار سے ڈرتے ہو؟“ ہمارا راجہ

رنجیت سنگھ نے کہا۔ ”اُسے صبح دربار میں پیش کرنا۔ اُس سے تلوار نہ لینا.... اور دیکھو اودھم سنگھ! سید احمد سے اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں جتنا تم سوچ رہے ہو۔“



اودھم سنگھ کی مزاجی کیفیت میں ذرا سی بھی تبدیلی نہ آئی۔ وہ اٹھ کر چلا گیا اور مہمان خانے جا پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ ہمت خان نماز پڑھ رہا ہے۔ اودھم سنگھ اُسے دیکھتا رہا۔ ہمت خان نے نماز ختم کر کے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے پھر ہاتھ منہ پر پھیر کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اودھم سنگھ کو دیکھ کر وہ حیران سا ہوا۔ اودھم سنگھ بیٹھ گیا۔

”میں تمہارے سالارِ اعلیٰ سید احمد کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ اودھم سنگھ نے کہا۔ ”میں نے اُس کے متعلق کچھ باتیں سنی ہیں۔“ آپ کو مجھ سے یہ اُمید نہیں کھنی چاہیے کہ میں ہر وہ بات بتا دوں گا جو مجھے نہیں بتانی چاہیے۔“ ہمت خان نے کہا۔ ”آپ نے میری عزت افزائی کی ہے لیکن میں آپ کو اپنا دوست نہیں کہہ سکتا۔ میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ ہماری فوج کتنی ہے، ہمارے ہتھیار کیسے ہیں اور ہمارا لڑنے کا طریقہ کیا ہے۔ میں آپ کو اپنے سالارِ اعلیٰ سید احمد کے متعلق بتا دوں گا کہ وہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔“

”میں یہی جانا چاہتا ہوں۔“ اودھم سنگھ نے کہا۔

”آپ کو میری باتیں اچھی نہیں لگیں گی۔“ ہمت خان نے کہا۔ ”یہ

مذہب کا معاملہ ہے اور ہر کوئی اپنے مذہب کو سچا سمجھتا ہے۔ پھر بھی آپ جو کچھ جانا چاہتے ہیں وہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ اُن کا نام سید احمد ہے۔ ہندوستان کے شہر بریلی کے رہنے والے ہیں۔ اللہ نے انہیں رُوح کی روشنی

دی ہے، اشارہ دیا ہے اور انہیں ایک منزل دکھائی ہے جو حق اور صداقت کی منزل ہے۔ سید احمد عالمِ دین ہیں لیکن وہ حجرے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والے اور منبر پر کھڑے ہو کر وعظ کرنے والے عالم نہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کا سبق دیتے ہیں۔ مسلمان کے لیے جہاد عبادت ہے۔ ہندوستان اسلامی ملک ہے۔ مسلمان بادشاہ اللہ کی راہ سے بھٹک گئے تو آپ نے دیکھا ہے کہ یہاں اسلام کا پرچم سرنگوں ہو گیا اور اس ملک پر سمندر پار سے آیا بُرا فرنگی قابض ہوتا چلا جا رہا ہے....

”سید احمد نے ہمیں سبق دیا ہے کہ قرآن کی رو سے مسلمان کسی کا غلام نہیں ہو سکتا کیونکہ غلامی میں اسلام کی رُوح مرجاتی ہے۔ سید احمد ہندوستان میں اللہ کی حکمرانی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت ملک کے حالات ایسے ہیں کہ جہاد لازمی ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ صرف جہاد کا سبق دیتے ہیں۔ کٹھار کو وہ حق کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان پر انسان کا قانون نہیں اللہ کا قانون چلے گا۔ ہمارے سالارِ اعلیٰ وہی کہتے ہیں جو قرآن میں لکھا ہے۔ وہ گاؤں گاؤں، نگر نگر گھوم آتے ہیں۔ سب سے پہلے مسلمانوں کو اپنا پیغام دیتے اور انہیں اللہ کا راستہ دکھاتے ہیں۔ انہیں کہتے ہیں کہ کفر کے خلاف جنگ ایک عبادت ہے۔ اور اللہ کی راہ میں تیغ زنی کے بغیر دین کا علم مکمل نہیں ہو سکتا....

”وہ جہاں جاتے ہیں وہاں کے مسلمان اُن کے مرید ہو جاتے ہیں اُن کی آواز میں ایسا جادو ہے کہ کوئی مسلمان اُن کے کہنے کو ٹال نہیں سکتا۔ اُن کی زبان میں خدا کی آواز ہے۔ بے شمار غیر مسلم بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہو گئے ہیں.... میں عالم نہیں جیتا انسان ہوں۔ میں اُن کی طرح بت نہیں کر سکتا اس لیے آپ کو میری زبان میں وہ جادو نظر نہیں آئے گا میری زبان میں وہ اثر نہیں۔ آپ کبھی اُن کی زبان نہیں تو آپ کہیں گے کہ انسان نہیں خدا بول رہا ہے، پھر آپ بھی میری طرح تیروں کی بارش میں بھی اور دُشمن کی تلواروں کے سامنے میں بھی نماز پڑھنے کی خواہش کریں گے۔ اگر آپ

بھروسے پر چھپیں گے کہ ہمارے لڑنے کا ریکہ کیا ہے تو میں صرف یہ جواب  
دوں گا کہ ہم اللہ کے بھروسے پر لڑتے ہیں۔“

سنگھ کوئی قوم نہیں تھی۔ یہ ایک قبیلہ تھا جس کی تاریخ میں حکمرانی اور  
جنگ و جدل کا نام و نشان نہیں ملتا تھا اس لیے وہ فنی حرب و ضرب سے  
عاری تھے۔ البتہ لڑنا جانتے تھے کیونکہ ان کا پیشہ ڈاکہ زنی اور رہزنی تھا۔  
یہ جرائم وہ گردہوں کی صورت میں کرتے تھے۔ سلطنت مغلیہ کے خاتمے کے بعد  
ہندوستان کی کیفیت دیگر گون تھی۔ انگریزوں نے جہانے کی کوشش کر رہے تھے۔  
کوئی حکومت نہیں تھی۔ اس افراطی سے سکھوں نے فائدہ اٹھایا اور پنجاب  
پر قابض ہو گئے۔ ان کا دور حکومت جبر کی طوالت صرف چالیس سال  
تھی، انگریزوں اور مسلمانوں سے لڑائیں لڑتے گذر گیا۔ مسلمانوں کو شدید  
نے تحریک مجاہدین کے پلیٹ فام پر متحد کر رکھا تھا۔

سکھوں میں اگرچہ فہم و فراست کی کمی اور خود سری اور سرکشی زیادہ تھی  
لیکن لاہور قلعے کا کماندار اودھم سنگھ سنجیدہ ذہن کا آدمی تھا۔ وہ سوچنا سمجھنا  
جانتا تھا۔ اُس نے سید احمد شہید کے قاصد سے اُن کے نظریات سُنے  
تو وہ اُن کا مذاق اڑانے کی بجائے خاموشی سے مہمان نمانے سے نکلا اُس  
کا جھکا ہوا سر اور چلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ گہری سوچ میں کھویا ہوا ہے۔



اگلی صبح مہاراجہ رنجیت سنگھ شاہانہ نعت پر بیٹھا تھا۔ یہ تخت کسی مسلمان  
بادشاہ کی یادگار تھا۔ رنجیت سنگھ کے چہرے پر فرعونیت تھی۔ اُس کا دربار ان  
روایتی بادشاہوں جیسا تھا جن سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ رنجیت سنگھ کے  
سامنے بیٹھے ہوئے درباریوں، پیچھے کھڑے محافظوں اور رانی پرستناٹھاری  
تھا کیونکہ مہاراجہ کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ جنگیں ہے۔ وہ دروازے کی  
طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو۔

ہمت خان دربار میں داخل ہوا۔ اس کے دائیں اور بائیں دو سکھ  
لمبی برچھیاں اٹھائے آ رہے تھے۔ ہمت خان رنجیت سنگھ کے سامنے

جائز کا اور بولا۔ ”السلام علیکم“۔ مہاراجہ نے سر کو جھٹکا دے کر درباریوں  
اور محافظوں پر نظریں دوڑائیں اور گرج کر پوچھا۔ ”اسے کسی نے بتایا نہیں  
کہ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دربار ہے جہاں آنے والا جھک کر سلام کرتا ہے؟“  
”مہاراجہ! تمہارا خاں نے کہا۔“ کوئی مجھے بتاتا تو بھی میرا،  
جھک کر سلام نہ کرتا۔ میں یہی پیغام لے کر آیا ہوں کہ کسی انسان کو حتیٰ حاصل  
نہیں کہ وہ کسی انسان کو اپنے سامنے جھکائے۔ اللہ کے بندے صرف اللہ  
کے سامنے جھکا کرتے ہیں۔“

”میں وہ پیغام جو تم سید احمد کا لائے ہو اُس کو تمہاری قسمت کا فیصلہ  
کر دوں گا۔“ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کہا۔ ”کیا تمہیں یہاں بھیجنے والے نے  
بتایا نہیں کہ رنجیت سنگھ کے دربار کے نام سے انگریز اور پٹھان کانپتے ہیں؟  
تم کس ہرتم میں جوانی کی نادانی اور جوش ہے۔“ اُس نے گرج کر کہا۔  
”پیغام کیا ہے؟“

ہمت خان نے گول کیا ہوا کاغذ کھولا اور بلند آواز سے پڑھنے لگا:  
”خدا کے حقیر بندے سید احمد کا پیغام، پنجاب کے حاکم  
مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام۔... میں تمہارے سامنے تین  
صورتیں رکھتا ہوں۔ پہلی یہ کہ اسلام قبول کرو، پھر تم ہمارے  
بھائی اور ہمارے مساوی ہو گے لیکن اس میں کوئی جبر  
نہیں۔ دوسری صورت یہ کہ اسلام قبول نہ کرو۔ ہماری اٹھا  
قبول کر لو اور جزیہ ادا کرتے رہو۔ اس صورت میں تمہارے  
جان و مال کی حفاظت ایسے ہی کریں گے جیسے ہم اپنے جان و  
مال کی کرتے ہیں اور تیسری صورت یہ کہ اگر تمہیں یہ دونوں صورتیں  
منظور نہ ہوں تو لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور سن لو کہ سارا  
پاکستان اور ملک ہندوستان کا ہر ایک مسلمان ہمارے ساتھ  
ہے۔ ہمیں شراب سے اتنی محبت نہیں جتنی ہمیں شہادت  
سے ہے۔... سید احمد۔ سالار اعلیٰ، لشکر مجاہدین۔“

اگر وہ لاہور کے میدانوں میں آگئے تو وہ لڑائی میں سہولت محسوس کریں گے۔  
”بُدھ سنگھ اس وقت کہاں ہوگا؟“ رنجیت سنگھ نے پوچھا۔  
”اس کے ساتھ کتنا لشکر ہے؟“

”وہ دریا کے اس طرف ہے۔“ دیوان نے اُٹھ کر جواب دیا۔  
”اُس کے ساتھ تقریباً سات ہزار نفری ہے۔“

”کافی ہے۔“ رنجیت سنگھ نے کہا۔ ”نہایت اچھے گھوڑے پر  
قاصد کو ابھی دوڑا دو۔ بُدھ سنگھ کو پیغام دو کہ فوراً کوڑہ پہنچ جائے اور کسی  
موزوں جگہ پر خیمہ زن ہو جائے، لیکن لشکر کو تیاری کی حالت میں رکھے اور  
وہاں کے کسی مسلمان کو بھیج کر معلوم کرے کہ سید احمد کے ساتھ کتنی نفری  
ہے۔ بُدھ سنگھ اپنے فیصلے خود کرے اور سید احمد کے لشکر کو ختم کرے۔“



ہمت خان کو دربار سے نکال کر کاہن سنگھ لے جا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ  
تین سکھ سپاہی تھے۔ ہمت خان اب نہتہ تھا۔ کاہن سنگھ کو اُس پر بہت غصہ  
آ رہا تھا کیونکہ ہمت خان قلعے میں داخل ہوا تھا تو کاہن سنگھ کے کہنے پر اُس نے  
کاہن سنگھ کو اپنی تلوار نہیں دی تھی۔ اُس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے بٹے  
دروازے کے پاس لے چلو اور ایک آدمی جا کر زانی کو لے آئے۔ کاہن سنگھ  
حیران تھا کہ ہمت خان منت سماجت کیوں نہیں کرتا کہ اس کی داڑھی کو نہ چھیرا  
جائے اور وہ مسکرا کیوں رہا ہے؟

”اونے مُلے!“ کاہن سنگھ نے ہمت خان کے پہلو میں ہلکا سا گھونسل  
مار کر کہا۔ ”تو ہمارا جہ سے معافی کیوں نہیں مانگ لیتا؟ میرے پاؤں پڑ میں  
شاید تجھے معاف کر کے قلعے سے نکال دوں۔“

ہمت خان نے مسکرا کر کہا۔ ”اللہ کی راہ میں ہمارے بازو اور ٹانگیں  
کٹ جاتی ہیں تو بھی ہم افسوس نہیں کیا کرتے یہ تو بال ہیں۔“ اُس نے  
آسمان کی طرف دیکھا اور وہ ہنس پڑا۔  
کاہن سنگھ پریشان ہو گیا۔ اُس نے ہمت سنگھ کو دروازے کے قریب

ہمارا جہ رنجیت سنگھ چھنکارنے لگا۔ محافلوں کے ہاتھ کرپانوں کے  
دستوں پر چلے گئے۔ درباری اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمت خان جس کے چہرے پر  
سیلتے سے تراشی ہوئی چھوٹی داڑھی تھی، ہونٹوں پر مسکراہٹ لے رنجیت سنگھ کے  
سلنے کھڑا تھا۔ اُس کی نظریں بڑی آہستہ آہستہ تمام دربار میں گھومنے لگیں۔ وہ  
ہر سکھ کا چہرہ اور ہاتھ کرپان کے دستے پر دیکھتا گیا۔ درباری حکم کے انتظار میں  
ہمارا جہ رنجیت سنگھ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صرف ایک سکھ تھا جس کا چہرہ  
بے تاثر تھا اور وہ لوں بیٹھا رہا جیسے اس منظر کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق نہ ہو۔  
وہ قلعہ دار اُدھم سنگھ تھا۔

”یہ لڑکا بڑی دُور سے آیا ہے۔“ رنجیت سنگھ نے کہا۔ ”میں اس  
کی ماں پر رحم کرتا ہوں۔ اسے قتل نہ کیا جائے۔ اس کا سرہ داڑھی اور پچیس بالکل  
مونڈھ کر اسے لاہور سے نکال دیا جائے۔“

کاہن سنگھ جتنے دار نے ہمت خان کے عقب سے چھپنا مارا اور اُس  
کی تلوار میان سے پھینک لی۔ پانچ چھ محافلوں نے ہمت خان کو گھیرے میں لے  
لیا اور اسے دھکیلے ہوئے دربار سے لے گئے۔

”سید احمد“ رنجیت سنگھ نے طنز یہ کہا۔ ”سید احمد... یہ یلیچہ مُسلے  
برباد ہو گئے ہیں مگر ابھی تک ان کے دماغ سے ہندوستان کی بادشاہی نہیں  
نکلے۔ مولویوں کی طرح دغظ کرنے والا سید احمد خالصہ راج سے ٹکر لینے آیا ہے۔

اُسے کسی نے بتایا نہیں کہ اب راج کرے گا خالصہ؟

”ہمارا راج!“ اُدھم سنگھ نے کہا۔ ”بغیر دیکھے، بغیر جانے دشمن کو  
مزدور سمجھیں۔ قاصد نوشہرہ سے آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا لشکر  
نوشہرہ تک آ گیا ہے۔ سید احمد نے شاید ٹھیک ہی لکھا ہو کہ تمام یاغستانی اُس کے  
ساتھ ہیں۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ہندوستان اور پنجاب کے مسلمان بھی نوشہرہ  
اور پشاور جا رہے ہیں۔ سید احمد نے ان میں کوئی اور ہی رُوح چھونک دی ہے۔  
ہمیں وہاں پیش بندی کر لینا چاہیے، نہیں تو خالصہ راج زیادہ دیر قائم نہیں  
رہ سکے گا۔ ہمیں مسلمانوں کو اکوڑہ اور نوشہرہ کی پہاڑیوں میں لانا چاہیے۔



روک لیا اور ایک سپاہی کو نالی کو لانے کے لیے بھیج دیا۔ تعلقے کا دروازہ کھلا۔  
دوسرا اندر آئے۔ گھوڑوں سے اتر کر انہوں نے گھوڑے دہیں رہنے دیئے۔  
وہ دروازے پر کھڑے سنتری سے کچھ پوچھنے کے لیے رُک گئے۔ دروازہ ابھی  
بند نہیں ہوا تھا کیونکہ دو بیل گاڑیاں آ رہی تھیں۔ بہت خان نے کاہن سنگھ کو  
بلے خبر دیکھا تو وہ دوڑ پڑا۔ گھوڑے پندرہ بیس قدم دُور تھے۔ بہت خان  
اُسی رفتار سے دوڑتا اُپر کرا اُچھلا اور ایک گھوڑے کی پٹھ پر چاڑھا۔ اُس  
نے لگام کو دروازے کی طرف جھٹکا دیا اور اڑ لگا۔ گھوڑا ہوا ہو گیا۔  
کاہن سنگھ نے شور مچایا اور دوسرے گھوڑے پر سوار ہو کر بہت خان  
کے پیچھے گیا۔ اُس کے پیچھے دو سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو کر گئے لیکن بہت خان  
دُور نکل گیا تھا۔ اُس کے لیے خطرہ یہ تھا کہ نہتہ تھا۔ دوسرا خطرہ یہ کہ فوجوں کے  
پاس توڑے دار انگلیں بھی آگئی تھیں جو سامنے سے بازو دار چھپرے بھر کر مار  
کی جاتی تھیں۔ اُس کے تعاقب میں آنے والے اُس پر فائر کر سکتے تھے۔ وہ  
عام راستے سے بٹ گیا۔ اُس زمانے میں راوی تک کا علاقہ گھنا جنگل تھا۔  
وہ اس جنگل میں دوسری سمت چلا گیا۔ چونکہ یہ سردیوں کا موسم تھا اس لیے  
جہاں کہیں سے دریا کا پاٹ چوڑا تھا وہ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا بہت خان  
نے جنوب کی طرف دُور جا کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اُس کے سامنے بڑا لمبا  
سفر تھا۔



اہلک سے پیشاور تک کے علاقوں پر سکھوں کی حکمرانی تھی۔ یہ حکمرانی نہیں  
بلکہ ٹوٹ کھوٹ، ظلم و تشدد، بے گار اور اندھیر گری تھی۔ سکھوں نے اس علاقے  
کو تقسیم کر کے ٹھیکے پر دے رکھا تھا۔ یہ ٹھیکیدار لوگوں سے مالہ، لگان اور کئی اقسام  
کے ٹیکس وصول کرتے اور سکھوں کا خزانہ بھرتے تھے۔ جہاں کہیں لوگ متحد  
ہو کر بغاوت کرتے، سکھ فوج جس کے جتنے جگہ جگہ موجود رہتے تھے بغاوت  
یا شورش کے مقام پر ٹوٹ پڑتے۔ وہاں کوئی مسلمان محفوظ نہیں رہتا تھا۔

فوج کے جانوروں کے لیے چارہ لوگوں کے کھیتوں سے کاٹ لیا جاتا۔ لوگ  
اناج باہر گڑھے کھود کر ان میں چھپا دیتے تھے کسی مسلمان کی عزت محفوظ نہیں  
تھی۔ عورتوں کو گھروں میں بند رکھا جاتا تھا۔

ذرائعوں اور پٹھانوں کو یہ سزا ان کے آپس کے نفاق کی پاداش میں مل رہی  
تھی۔ وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ آپس کی عداوت کی وجہ سے  
ان پر سکھ غالب آ گئے تو بھی انہوں نے متحد ہونے کی نہ سوچی بلکہ ایک دوسرے  
کو زک پہنچانے کے لیے انہوں نے سکھوں کی چالپوسی شروع کر دی اور  
اپنے مسلمان بھائیوں کو نقصان پہنچانے لگے۔ یہ صورت حال سکھوں کی حکومت  
کے لیے سود مند تھی۔ انہوں نے پٹھانوں میں اپنے لیے غدار پیدا کر لیے۔  
عداوتیں سرداروں کی تھیں۔ سزا لوگوں کو مل رہی تھی۔ پٹھان عوام سکھوں  
کو اپنا حاکم تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن اتحاد اور قیادت کے بغیر وہ ظلم و تشدد سہنے  
کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان حالات میں سید احمد شہید اس علاقے  
میں آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے کنہیوں کو ساتھ لے کر بیابان  
میں جا چھپے اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ سید احمد شہید نے ان لوگوں  
کو سکھوں کے خلاف اتحاد کی دعوت دی۔ لوگوں نے سکھ کا سامنا لیا۔  
مسجدوں سے ایک بار پھر اذانوں کی اور کلمہ طیبہ کی بلند آوازیں سنائی دینے لگیں۔



بہت خاں جب نوشہرہ پہنچا اُس وقت وہ نیم جاں تھا۔ اُس کا چہرہ  
لاش کی مانند تھا۔ اُسے فوراً سید احمد شہید کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس نے  
ہانپتے کانپتے بتایا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اُن کے پیغام اور پیغام لے  
جانے والے کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ سید احمد شہید نے اُسی وقت  
جنگ کی تیاری کا حکم دے دیا۔

اُسی روز مذہب سنگھ کی نیم گاہ میں جواہر کے کہیں قریب تھی لاہور کا سکھ  
قاصد پہنچا اور مذہب سنگھ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا حکم نامہ دیا کہ سید احمد اور اس کے  
مریدوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اور اگر وہ فوج کی صورت میں منظم ہوں

تو حملہ کر کے انہیں ختم کر دیا جائے۔

بُدھ سنگھ نے اس سے پہلے ہی اپنا قاصد لاہور کو دوڑا دیا تھا۔ وہ رنجیت سنگھ کے دربار میں پہنچ چکا تھا۔ اُس نے تیدا احمد شہید کی سرگرمیوں کی اطلاع دے دی تھی۔ بُدھ سنگھ نے پیغام بھیجا کہ تیدا احمد نام کے جس آدمی کے چرچے ہم نے پہلے سُنے تھے وہ نوشہرہ تک آگیا ہے۔ ہمارے وفادار مسلمان سرداروں نے اُس کے متعلق جو خبریں دی ہیں انہیں ہم معمولی نہیں کہہ سکتے اور اس شخص کو ہم عالم، صوفی یا درویش بھی نہیں کہہ سکتے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ جنگجو ہے اور وہ کابل، قندھار، گرد و نواح کے علاقوں میں فن سپہ گری کے کمال دکھا چکا ہے۔ مجھے خبروں نے بتایا ہے کہ تیدا احمد نے لاہور دربار کو کوئی پیغام بھیجا ہے۔ اگر آپ نے اس پیغام کو بڑا کیا تو یہ خالصہ راج کی موت کا باعث ہوگا اور اگر قاصد کو دھککا دیا تو مسلمان تیدا احمد کے جھڈے تلے ہم پر حملہ کریں گے بچان اس جھڈے تلے جمع ہو رہے ہیں۔

بُدھ سنگھ نے پیغام میں لکھا کہ اکوڑہ کا ریس امیر خان خشک ہمارا مخالف ہے لیکن اُس کے بھائی فیروز خان کا بیٹا خواص خان امیر خان کے خلاف ہو گیا ہے۔ اُس نے مجھے اکوڑہ بلایا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اپنا لشکر اکوڑہ کے قریب خیمہ زن کروں اور اُس کے چچا امیر خان خشک اور تیدا احمد کو وہیں ختم کروں۔ بُدھ سنگھ نے پیغام میں ہمارا اجر رنجیت سنگھ سے درخواست کی کہ اُسے لاہور سے فوراً لکھ بھیجے جانے کیونکہ تیدا احمد سے لڑائی کے دوران یا اس کے بعد ہمارے وفادار بچان سرداروں میں سے ایک دونے بھی بغاوت کر دی تو میرے لیے بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی۔

ہمارا اجر رنجیت سنگھ نے اُس وقت لاہور کے قلعہ دار اودھ سنگھ اور اپنے ایک اور کماندار ہری سنگھ کو طلب کیا اور انہیں بُدھ سنگھ کا پیغام سنا کہ حکم دیا کہ وہ انتہائی تیز رفتار سے لکھ لے کر اکوڑہ روانہ ہو جائیں۔ جب تیدا احمد جنگ کی تیاری کا حکم دے رہے تھے اُس وقت بُدھ سنگھ اکوڑہ خشک کے قریب پہنچ گیا اور اودھ سنگھ اور ہری سنگھ اپنے دستوں کے

ساتھ انک کے قریب دریا عبور کر رہے تھے۔ تیدا احمد شہید کے لیے یہ جگہ نئی تھی۔ لوگ اُن کی لپکار پر اُن کے گرد جمع ہو گئے تھے لیکن تیدا احمد شہید مقام تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں کی وفاداریاں مشکوک ہیں اور ان میں گھر کے بھیدی اور غدار بھی ہوں گے۔ تیدا احمد شہید نہیں چاہتے تھے کہ میدان جنگ میں جب وہ دشمن سے ٹھٹھکا ہو چکے ہوں اُن کا کوئی اپنا بھائی اُن کی بیٹی میں چھرا گھونپ دے۔ چنانچہ نئے لوگوں کی جانچ پڑتال میں بہت دن لگ گئے۔

تیدا احمد نے جو فوج تیار کی اس کی تعداد (نورین کے مطابق) صرف ڈیڑھ ہزار تھی۔ سکھوں کی نفرتی سات ہزار بھی لکھی گئی ہے اور دس ہزار بھی اس میں اودھ سنگھ اور ہری سنگھ کی کمک بھی شامل تھی۔ تیدا احمد شہید نے اپنی اس قلیل جمیعت کو حسب معمول چار حصوں میں تقسیم کیا۔ دائیں جانب مولوی محمد یوسف کی جماعت تھی۔ بائیں بازو پر تیدا محمد یعقوب کی جماعت کو رکھا گیا لیکن اکوڑہ کی جنگ میں تیدا یعقوب نہیں تھے اس لیے قیادت اُن کے نائب شیخ بڑھن کو دی گئی۔ ہراول میں مولوی محمد اسماعیل تھے۔ چوتھی جماعت اللہ بخش خان کی قیادت میں تھی جو مجدد ارشد بخش کے نام سے مشہور ہوئے۔

۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء (۲۰ جمادی الاول ۱۲۴۲ھ) تیدا احمد شہید نے اپنے ان چاروں کمانڈروں کا اجلاس بلایا جو ظہر کی ناز کے بعد شروع ہوا۔



اس اجلاس میں چاروں کمانڈروں کے علاوہ مجلس مشاورت کے ارکان بھی موجود تھے۔ تیدا احمد شہید نے حاضرین کو بتایا: ”ہمارے غزروں نے اطلاع دی ہے کہ سکھوں کی نفرتی دس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ انہوں نے اپنی خیمہ گاہ کے ارد گرد پتھروں کی فصیل کھڑی کر دی ہے جسے یہ لوگ سنگھ کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے خاردار جھاڑیاں اتنی زیادہ رکھ دی ہیں جن سے گھوڑے بھی نہیں گزر سکتے۔ سنگھ ایک گز سے ذرا اونچا ہے۔ سکھ اپنی خیمہ گاہوں کو اسی طرح محفوظ کیا کرتے ہیں۔ ان کی خیمہ گاہ کے ایک طرف دریا ہے۔ ہماری کل تعداد ڈیڑھ ہزار ہے۔ اپنے اللہ کے اس فرمان کو نہ ٹھونکنا کہ تم اگر ایمان والے اور ثابت قدم رہے تو تم میں سے میں دو سو پر غالب آئیں گے۔ مسلمانوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے۔“

ساتھ جو سلوک ہوا تھا اس کا وہ انتقام لینے کو بے تاب تھا۔ لاہور سے اس کی واپسی کا سفر بڑا ہی کٹھن تھا۔ اتنے دنوں کی مسلسل گھوڑ سواری بے لابی اور جھوک پیاس نے اس کی ہڈیاں توڑ ڈالی تھیں مگر اس نے منت کر کے شجون میں اپنا نام دے دیا۔



”مسلمانوں کی نفری اتنی تھوڑی ہے کہ وہ ہمارے سائے کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ اکوڑہ خٹک کے قریب سکھوں کی خیرہ گاہ میں رات کے وقت ہری سنگھ، اودھ سنگھ اور بدھ سنگھ سے کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز شراب کے نشے سے بے قابو سی لگتی تھی۔ اس نے کہا: ”بدھ سنگھ! تم سید احمد کے نام سے ڈر گئے ہو۔“

”اوئے ہری سنگھ! بدھ سنگھ نے ہری سنگھ کی ران پر ہاتھ مار کر کہا: ”چل لڑائی نہ ہوئی تو یہاں کچھ دن عیش موج کر جا.... میں سید احمد کے نام سے نہیں ڈرا۔ تو بھی سوچ، ان مسلوں پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا انہوں نے حکومت کی ہے۔ یہ اٹھ کھڑے ہوئے تو نہ ہری سنگھ رہے گا نہ بدھ سنگھ اور تیرا مہاراجہ رنجیت سنگھ مسلمانوں کے جھٹ جھونک رہا ہوگا۔“

اودھ سنگھ پاس بیٹھلہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے بھی کہا کہ مسلمان اگر خود کشی نہیں کرنا چاہتے تو وہ اتنی تھوڑی نفری سے ہمارے مقابلے میں نہیں آسکتے۔

اس وقت جب یہ بات ان سکھ کمانڈروں کے دماغوں تک پہنچ چکی تھی، ایک نوجوان سکھ خیرہ گاہ کی خافتی فسیل کے باہر دبے پاؤں چل رہا تھا۔ وہ بھی ان جھانڑیوں کو دیکھتا جو پتھروں کی فسیل کے ساتھ کبھی تھیں، کبھی اڑیاں اٹھا کر فسیل کے اوپر سے خیرہ گاہ کو دیکھنے کی کوشش کرتا۔ رات کی تاریکی میں سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خیرہ گاہ میں خاموشی تھی۔ یہ نیند کا سکوت تھا جسے کبھی کسی گھوڑے کی آواز اور کبھی کسی سنتری کی آواز توڑتی اور رات بھر خاموش ہو جاتی۔

یہ نوجوان سکھ تمام تر خیرہ گاہ کے گرد گھوم گیا اور جدھر سے آیا تھا اُچھر ہی چلا گیا۔ کچھ دُور جا کر اُسے آواز سنائی دی۔ ”آگئے ہمت خان! وہ

اس کی کو ایمان کی قوت سے پُورا کرنا ہے....“ آپ سب محسوس کرتے ہوں گے کہ اتنی قلیل نفری اتنی کثیر فوج کے خلاف کتنے سامنے کی لڑائی نہیں لڑ سکتی۔ ہمیں شجون مارنا پڑے گا اور اس کے بعد بھی ہم ضرب لگاؤ اور اِدھر اُدھر ہو جاؤ، کا طریقہ اختیار کریں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ لڑائی کسی طرح لڑی جاتی ہے۔ آپ میں سے کون آج رات شجون مارنے کو تیار ہے؟“

کون تھا جو کہتا کہ وہ تیار نہیں؟ لیکن سید احمد شہید کی نظر انتخاب جمعدار اللہ بخش پر پڑی۔ جمعدار اللہ بخش ہندوستان کے ضلع انانڈ کے رہنے والے تھے اور انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ سید احمد شہید نے تحریک مجاہدین کا علم بلند کیا تو جمعدار اللہ بخش اُن سے آئے اور اُن کے دست راست بن گئے۔ ”مجاہدین! سید احمد شہید نے کہا۔“ خدا نے ذوالجلال ہماری

فیتوں اور ہمارے مقاصد سے آگاہ ہے۔ ہم اپنی حکمرانی قائم کرنے کے لیے وطن سے بے وطن نہیں ہوئے۔ ہم مسلمانوں کی حکمرانی بحال کرنے نکلے ہیں۔ ہمیں ملک ہندوستان کو کفر کی غلاظت سے پاک کرنا ہے۔“

اجلاس کے حاضرین کو ایسے غلط کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گھروں سے سرکھن نکلے تھے۔ انہوں نے اجلاس سے پہلے ظہر کی نماز سید احمد کے پیچھے پڑھی تھی۔ انہوں نے جب دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اُن کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ مقتدی جاتے تھے کہ اُن کا امام خدا کے حضور گرد گودا رہا ہے اور فتح و نصرت کی بھیک مانگ رہا ہے۔ بہت سے مقتدیوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

اجلاس میں سید احمد شہید نے ایمان اور جذبات کی باتوں کے بعد جمعدار اللہ بخش کو شجون مارنے کے متعلق کچھ ہدایات دیں۔ کچھ دیر بحث و مباحثہ ہوا اور شجون کی سکیم تیار ہو گئی اور یہ بھی طے ہو گیا کہ کتنی نفری جائے گی۔ اس نفری میں ہمت خان بھی شامل تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر پیش کیا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں اُس کے

میں اور شراب پیلے دی جاتی تھی۔ وہ شراب کے زور پر لڑتے تھے۔ سنتری بیدار تھے اور گھوم پھر رہے تھے۔ چھاپہ مار دے پاؤں خیمہ گاہ کی حفاظتی باڈ اور بچہروں کے سنگھ سے دور دور بہت خان کی راہنمائی میں اُس مقام تک جا رہے تھے جہاں سے اندر جانا تھا۔

بعض مؤرخوں نے چھاپہ ماروں کی نفری ایک سولہوی ہے اور بعض نے زُسو کے قریب، لیکن شیخون میں اکثر کم سے کم نفری لے جانی جاتی تھی۔ تعداد نو سو نہیں ہو سکتی۔ بہر حال یہ ضبش اُس مقام کے قریب پہنچ گیا جبکہ اندر بخش نے وہ جگہ دیکھی اور سنگھ کے باہر کی خاردار جھاڑیاں ایک طرف کرا دیں اور دو چھاپہ مار دپوار سے اندر کود گئے۔ انہوں نے اندر کی طرف بھپائی ہوئی جھاڑیاں ہٹا دیں۔ وہاں سے کچھ اور چھاپہ مار اندر چلے گئے۔ ان میں سے چار اپنی تواریں سونتے ایک جگہ چھپ گئے تاکہ سنتری ادھر آئیں تو انہیں ختم کر دیا جائے۔

بہت خان جب اکیلا آیا تھا تو نہیں دیکھ سکا تھا کہ سنتریوں کے پاس ہتھیار کیا ہیں۔ ان کے پاس برچھیاں نہیں بلکہ توڑے دار بند قیں تھیں۔ چھاپہ مار اندر چلے گئے۔ انہوں نے اس طرف کے خیموں کی رسیاں کاٹ دیں اور اوپر سے برچھیاں مارنے لگے۔ خیموں میں دبے ہوئے سنگھ مرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ شور اٹھا تو کسی سنتری نے ادھر کو بندوق کر کے فائر کر دیا۔ تمام چھپے مولانا باقر علی عظیم آبادی کے سینے میں اُتر گئے۔ مولانا نے بلند آواز سے پکارا۔ ”میرے دوستو! مجھ سے ہتھیار لے لو۔ یہ اللہ کی امانت ہے۔ انہیں شکن ماتھ نہ لگاتے۔ وہ گرے اور شہید ہو گئے۔ وہ اس شیخون کے پہلے شہید تھے۔

اس کے بعد ایک قہر تھا جو سنگھوں پر ٹوٹ پڑا، ایک قیامت تھی جو بپا ہوئی۔ مجاہدین خیموں کی رسیاں کاٹتے اور گرے ہوئے خیموں میں بھجیاں مارنے چلے جاتے تھے۔ کسی مجاہد چھاپہ مار نے ایک خیمے کو آگ لگا دی۔ سنگھوں کی تعداد دس ہزار تھی۔ اتنی مخلوق بڑا کر بیدار ہوئی، اپنے ساتھیوں کی چیخ و پکار اور اللہ اکبر کے نعروں کی گرج سنی تو سوائے بھانگنے کے کچھ نہ سوچ سکی۔ بہت کم سنگھوں نے سمجھنے کی کوشش کی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ مقابلے کے لیے تیار

اُس طرف گیا۔ اُس نے مصنوعی داڑھی چہرے سے نوچ کر پھینک دی۔ اس کے نیچے اُس کی اپنی بڑی خوبصورت داڑھی تھی۔ اُس نے سر سے گڑی بھی اُتار پھینکی جو اُس نے سنگھوں کی طرح باندھ رکھی تھی۔ وہ سنگھ نہیں بہت خان تھا جو سنگھوں کے بھیس میں خیمہ گاہ کا جائزہ لینے گیا تھا اور اُس کے انتظار میں جبکہ اندر بخش کھڑا تھا۔ بہت خان نے جبکہ اندر بخش کو خیمہ گاہ کی کیفیت تفصیل سے بتائی اور کہا کہ شیخون کے لیے فضا صاف ہے۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ ان چھاپہ مار جانبا زوں نے مقامی چٹانوں کی راہنمائی میں چھوٹی، چھوٹی کشتیوں سے دریائے کامل عبور کیا تھا کیونکہ خشکی کے راستے پر سنگھ فوج کشت پر رہتے تھے اور گشت کی نفری زیادہ ہوتی تھی۔ دریائے کر کے بہت خان کو خیمہ گاہ کے جائزے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ بہت خان نے سنگھ میں ایک جگہ دیکھ لی تھی جہاں سے اندر جایا جاسکتا تھا۔

جبکہ اندر بخش نے اپنے جانبا ز چھاپہ ماروں کو آخری ہدایات دیں اور کہا۔ ”ہم سب نے ایک دوسرے کا کما سنا معاف کر دیا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کون زندہ واپس جائے گا۔ صرف یہ خیال اپنے سامنے رکھو کہ آج کا شیخون تمہارا آخری فرض ہے اور اس کے بعد تم خدا کے حضور چلے جاؤ گے۔ اب یہ فیصلہ خود کرو کہ اللہ کے حضور سر خود ہو کر جانا ہے یا فرض سے نظریں پڑا کر ملعون کے رُوپ میں۔“

چھاپہ ماروں کے اس حش میں کسی کی بھی آواز نہ لگی کیونکہ انہیں خاموشی برقرار رکھنے کی بڑی سخت ہدایت دی گئی تھی۔ انہوں نے اللہ اکبر کے نعروں یوں سینوں میں روک رکھے تھے جیسے عقابوں کو سچرے میں بند کر دیا گیا ہو اور وہ پنجرے توڑنے کو بھڑ پھڑا رہے ہوں۔

دس ہزار سنگھوں کی خیمہ گاہ میں نیند کا موت جیسا سکوت طاری تھا۔ بے ہوشی کی اس نیند میں ایسی شراب کا عمل دخل زیادہ تھا۔ سنگھ شراب کے بغیر اُس پودے کی مانند ہوتا ہے جسے پانی نہ ملے۔ لہذا سنگھوں کی فوج کو پانی بعد



ہوئے لیکن سامنے کوئی دشمن ہوتا تو مقابلہ کرتے۔ وہاں تو بھگت اور نفسا نفسی تھی۔

جمعدار اللہ بخش کی نظر سکھوں کی توپوں پر تھی۔ انہوں نے چند ایک چھاپہ مار اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک سکھ کو پکڑ لیا اور اُسے جان بخشی کا وعدہ دے کر پوچھا کہ تو ہیں کہاں ہیں۔ سکھ انہیں توپوں تک لے گیا۔ جمعدار اللہ بخش نے اُسے بھگا دیا۔ اب یہ توپیں مجاہدین کی تھیں خیر گاہ میں کئی جگہوں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ گھوڑوں کی ہنہا ہٹ خوفناک تھی۔ وہ آگ اور غل غلاٹے سے بدکتے اور بڑی زور زور سے ہنہاتے تھے۔ اکی ڈکی گولی بھی چلتی تھی۔

کماندار اُدھم سنگھ کا خیمہ کچھ دور تھا۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں اٹھا۔ نیچے سے باہر آیا تو اُس کا دل ڈوب گیا۔ اُس کی دس ہزار نفری کا قتل عام ہو رہا تھا۔ وہ بدھ سنگھ کے خیمے میں دوڑتا گیا مگر خیر خالی تھا۔ اُسے پتہ نہ چل سکا کہ بدھ سنگھ اس ڈر سے بھاگ گیا ہے کہ مسلمانوں کی بہت زیادہ نفری نے حملہ کر دیا ہے اور اب جان بچانے کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ ہری سنگھ بھی لاپتہ تھا۔ جمعدار اللہ بخش نے دیکھا کہ شیخوں کا مقصد پورا ہو چکا ہے تو اُس نے اپنے ساتھ جو تین قاصد رکھے ہوئے تھے انہیں کما کر مجاہدین سے چلا کر کمر خیر گاہ سے نکلوا اور دریا کے کنارے پہنچو۔ جمعدار اللہ بخش نے خود بھی بڑی بلند آواز میں احکام دینے شروع کر دیے مگر مجاہدین اپنی کامیابی سے اس قدر سرشار تھے کہ کوئی حکم نہیں مان رہے تھے۔ دس ہزار نفری کی خیر گاہ جس میں رسد گھوٹے اور سیل گاڑیوں کے سیل اور سینکڑوں ملازم بھی تھے، دو میل سے زیادہ رقبے میں پھیل ہوئی تھی۔ مجاہدین سکھوں کی بندوقیں، بارود اور دیگر ہتھیار اکٹھے کر رہے تھے۔

آخر اکبر خان نام کے مجاہد کی کوششوں سے مجاہدین خیر گاہ سے نکلنے لگے۔ اُس وقت بھی بندوقیں فائر ہو رہی تھیں۔ کہیں دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔ جمعدار اللہ بخش مجاہدین کو باہر لگانے کے لیے بھاگ دوڑ رہے تھے کہ کسی بندوق

کے چہرے اُن کے جسم کو چھلنی کر گئے اور وہ شہید ہو گئے۔ اکبر خان نے جو قہدار کے رہنے والے تھے، دیکھ لیا اور چھاپہ ماروں کی قیادت سنبھال لی۔

صبح صادق کا وقت تھا جب چھاپہ مار مجاہدین خیر گاہ سے تقریباً دو میل دور اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اذان دی اور نماز فجر باجماعت پڑھی۔ نماز کے بعد شہیدوں کے لیے دُعا ئے مغفرت کی۔ جماعت میں سے جو جانا بزر غیر حاضر تھے ان میں ہمت خان بھی تھا۔ اس کے متعلق یہی سمجھ لیا گیا تھا کہ شہید ہو گیا ہے۔



اُدھم سنگھ کی آنکھ اُس وقت کھلی تھی جب چھاپہ مار خیر گاہ پر چھا چکے تھے اور سکھوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ اُسے اپنے دونوں ساتھی کماندار بدھ سنگھ اور ہری سنگھ نہ ملے تو وہ ایک طرف ہو کر دیکھنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ کماند نہیں لے سکتا تھا۔ وہ اس صورت حال پرست اور پانے کے قابل نہیں تھا۔ وہ بھاگنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی فوج میں جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو کمانڈر اپنے دستوں پر قابو نہیں رکھتے۔ اُس نے اپنی کرپاں بھی نیام سے نہ نکالی اور ایک طرف چل پڑا۔ شیخوں اور دیگر جلتے ہوئے سامان کے شعلوں کی روشنی اتنی تھی کہ اُسے نظر آ رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ اُس نے اپنے سکھ سپاہیوں کی لاشوں سے ٹھوکریں بھی کھائیں اور وہ خیر گاہ کے دروازے تک چلا گیا۔ بندوقیں بھی فائر ہو رہی تھیں۔ وہ کسی بندوق کے فائر کیے ہوئے چھردوں کی زد میں آ گیا۔ زیادہ تر چہرے اُس کے بازو میں اُترے اور کچھ سینے کے ایک طرف پیٹھے میں اور کچھ سر میں لگے۔ وہ دروازے سے نکل گیا۔ وہ سنگھ کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ اُسے چکر آچھو وہ گر پڑا۔ ہمت خان اُس وقت خیر گاہ سے نکلا جب اُس کے سارے ساتھی جو زندہ تھے جا چکے تھے۔ اُس نے اپنی بے عزتی کا انتقام لے لیا تھا خیر گاہ کے دروازے سے نکلتے اُس نے خیر گاہ کو دیکھا۔ شعلے بجھتے جا رہے تھے۔ خیر گاہ تباہی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہمت خان کو عجیب سا سکون محسوس ہوا۔

اُس کے قریب سے سکھ دوڑتے گزر رہے تھے۔ اُس کی طرف کوئی دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

ہمت خان سنگھ کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ جہاں سنگھ ختم ہوا وہاں سے زمیں نیچے کو جا رہی تھی۔ وہ نیچے اترنے لگا اور اس کے دائیں بائیں دو ٹیکریاں آگئیں۔ ان سے گزرتے صبح کی سپیدی نکھرنے لگی۔ اُس کے ساتھی نماز پڑھ کر اُس کے لیے دعائے مغفرت کر چکے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی زمیں پر پڑا ہے۔ وہ لاش ہی ہو سکتی تھی۔ وہ دوڑ کر اُس کے قریب گیا کہ یہ کوئی اُس کا اپنا ساتھی ہی نہ ہو۔

وہ اُس کا اپنا ساتھی نہیں کوئی سکھ تھا۔ اُس نے حقارت سے ہاتھ پیچھے کر لیا لیکن صبح اتنی صاف ہو چکی تھی کہ اُسے اُس شخص کا چہرہ اچھی طرح نظر آ گیا۔ ہمت خان نے جھک کر اُسے دیکھا تو اُس کے منہ سے نکلا۔ ”اوہ یہ تو اُدھم سنگھ ہے۔“ تب اُس نے اُس کی نبض پر انگلیاں رکھیں۔ وہ زندہ تھا۔ ہمت خان کو لاہور قلعے میں اُدھم سنگھ کا سلوک یاد تھا۔ اُس نے وہاں ہمت خان کی یہ عزت افزائی کی تھی کہ جب اُسے کہا جا رہا تھا کہ وہ توار اُتار دے تو اُدھم سنگھ نے سکھوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اُس کی توار اُس کے پاس رہنے دیں۔ دربار میں تمام محافظوں نے تواریں نکال لی تھیں اور سارے درباری اُس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت اُس نے اُدھم سنگھ کو دیکھا تھا۔ وہ واحد آدمی تھا جو اُسے غصیلی نظروں سے گھور نہیں رہا تھا اور اُس نے اپنی کمرپان کے دستے پر ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ اُس رات اُدھم سنگھ اُس کے پاس نمان خانے میں گیا اور اُس کی باتیں توجہ سے سنتی تھیں۔ اُدھم سنگھ کے اس سلوک کے علاوہ ہمت خان نے اس شخص میں نہ جانے کیا دیکھا تھا کہ وہ اُسے اچھا لگا تھا۔

اُس نے کہا۔ ”اُدھم سنگھ ازندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن میں تمہیں یہاں نہیں مرنے دوں گا۔ تمہیں بچانے کی کوشش ضرور کروں گا۔“ لیکن اُدھم سنگھ بے ہوش پڑا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ ہمت خان نے گھٹنے ٹیک کر اُسے اُٹھایا اور کندھے پر ڈال کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے قوی ہیکل آدمی کے

بوجھ تلے وہ چل پڑا۔



اُدھم سنگھ بوش میں آیا تو اُس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر اور اُدھر دیکھا۔ اُسے اپنے اوپر چھپ نظر آئی اور اُس کے پاس جانی پہچانی شکل و صورت کا ایک جوان سال آدمی بیٹھا تھا۔ اُدھم سنگھ نے اپنا دایاں بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا پایا۔ سر پر بھی پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اُس کے ہونٹوں سے حیرت زدہ مگر کشتی نکلی۔ ”ہمت خان؟.... مجھے تم یہاں لائے ہو؟“

جب ہمت خان نے اُسے بتایا کہ وہ کہاں سے اور کس طرح اُسے اُٹھا لایا ہے تو اُدھم سنگھ حیرت سے جیسے سُک ہو گیا۔ وہ اس علاقے کی دشواریوں اور فاصلوں سے واقف تھا۔ اتنے میں ایک آدمی اندر آیا اور اُس نے کہا۔ ”امیر المؤمنین تشریف لا رہے ہیں۔“ ہمت خان اُٹھ کھڑا ہوا۔ سید احمد شہید اندر آئے۔ اُدھم سنگھ اُٹھ بیٹھا اور جڑے غور سے سید صاحب کو دیکھنے لگا۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کے زخم گہرے نہیں۔“ سید احمد شہید نے اُدھم سنگھ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہمت خان نے مجھے بتایا ہے کہ لاہور میں آپ نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ ہمارا سلوک بھی آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔“

”میں آپ کا قیدی ہوں۔“ اُدھم سنگھ نے کہا۔ ”آپ میرے ساتھ جو سلوک چاہیں کر سکتے ہیں۔ میں اگر مایوس ہوں گا بھی تو آپ کا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔“ ”آپ ہمارے قیدی نہیں ممان ہیں۔“ سید احمد شہید نے کہا۔ ”زخم ٹھیک ہونے تک آپ ہمارے ممان رہیں گے، پھر آپ کو اُنسی عزت اور احترام سے رخصت کیا جائے گا جو ایک کماندار اور قلعہ دار کا حق ہے۔ میں آپ کے لیے دُعا کروں گا۔ آپ جلدی صحت یاب ہو جائیں گے۔ اور سید صاحب اُدھم سنگھ کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلے گئے۔

اُدھم سنگھ کی نظریں دروازے پر جمی رہیں جس میں سے سید احمد شہید نکل گئے تھے۔ ہمت خان کی آواز نے اُسے چڑکا دیا۔ ”یہ میں سید احمد، ہمارے

سالار اعلیٰ اور امیر المؤمنین جن کے متعلق آپ نے مجھ سے لاہور قلعے میں پوچھا تھا۔  
 ”ہاں، یہ شخص اپنے آپ میں جادو کا اثر رکھتا ہے۔“ اودھم سنگھ نے کہا۔  
 جس مکان میں اودھم سنگھ کو رکھا گیا تھا یہ اکوڑہ خٹک سے کچھ دور ایک  
 گاؤں کا کچا مکان تھا۔ اودھم سنگھ کی ہر روز مرہم پٹی ہونے لگی اور اُسے نہایت  
 اچھا کھانا دیا جانے لگا۔ سید احمد شہید اُس کی تیمارداری کو آتے تھے۔ انہوں نے  
 اُس پر کبھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ اُسے دشمن یا غیر مسلم سمجھا جا رہا ہے۔ علی الصبح اُس  
 کے کانوں میں بڑی سُرپی آواز پڑتی۔ اودھم سنگھ کو معلوم تھا کہ کوئی قرآن پڑھ رہا  
 ہے لیکن کسی آواز میں کبھی اُس نے یہ تاثر غمخس نہیں کیا تھا۔

ایک روز ہمت خان اُس کے پاس اکیلا بیٹھا تھا۔ اودھم سنگھ جیسے چھٹ  
 پڑا۔ بولا۔ ”ہمت خان! میں سکھ ہوں۔ مجھ پر رحم نہ کرو۔ ہم مسلمانوں کو  
 اذیتیں دے دے کر مارتے ہیں تو ہمیں لطف آتا ہے۔ ہم مسلمان عورتوں کی عزت  
 لوٹ کر ناپا کرتے ہیں مسلمانوں کے بچوں کو قتل کر کے ہم قہقہے لگایا کرتے ہیں۔ تم  
 میرے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کیوں کر رہے ہو۔“

”ہم یہ نہیں دیکھ رہے کہ آپ سکھ ہیں۔“ ہمت خان نے کہا۔ ”ہم یہ  
 یاد رکھتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم صرف میدان جنگ میں قتال کرتے ہیں جو رت  
 بچہ، نہتہ آدمی اور زخمی کسی بھی قوم کا ہو ہم اُس پر ہاتھ نہیں اٹھاتے ہمارا ایمان  
 نے آپ کے ہمارا جو قبول اسلام کا پیغام بھیجا ہے لیکن آپ کو نہیں کہا کہ اسلام  
 قبول کر لیں کیونکہ آپ ہمارے دم کو دم پر ہیں۔“

”اگر میں اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لوں تو؟“  
 ”ہمیں یقین کرنا پڑے گا کہ آپ کسی خوف یا لالچ سے اسلام قبول نہیں کر  
 رہے۔“ ہمت خان نے جواب دیا۔

ایک روز اودھم سنگھ کو جب وہ صحت یاب ہو چکا تھا اور باہر گھومنے پھرنے  
 لگا تھا، پتہ چلا کہ سید احمد شہید گاؤں میں موجود ہیں۔ وہ اُن کے کمرے میں چلا گیا اور  
 اُن کے پاؤں پر سر رکھ کر کہا کہ اُسے مسلمان کر لیا جائے۔ اُسے کہا گیا کہ وہ آزاد ہے  
 وہ واپس جاسکتا ہے لیکن اُس نے یہی ایک رٹ جاری رکھی کہ وہ مسلمان ہونا

چاہتا ہے۔ آخر سید احمد شہید نے اُسے کلمہ طیبہ پڑھا کر مسلمان کر لیا اور اُس کا نام  
 اسماعیل رکھا۔

مسلمان ہو کر اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں اور جوان بہن بھی اُس کے ساتھ  
 آئی تھیں۔ اُس زمانے میں کماندار اور عہدیدار اپنی بیویوں کو اور بعض اپنے کنوئوں  
 کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اودھم سنگھ اپنی ماں اور اپنی بہن کو اپنے ساتھ  
 لایا تھا۔ انہیں خیر گاہ میں رکھنے کی بجائے اُس نے انہیں اکوڑہ سے کچھ دور ایک  
 گاؤں میں رکھا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ انہیں اپنے پاس لانا چاہتا ہے۔ وہ علاقہ  
 سکھوں کی بڑی ظالم عہداری میں تھا۔

وہ انہیں لانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ مجاہدین کے ایک جاسوس نے اطلاع  
 دی کہ اسماعیل کے قبول اسلام کی خبر بدھ سنگھ تک پہنچ گئی ہے اور اُس نے حکم  
 دیا ہے کہ اسماعیل (اودھم سنگھ) کی ماں اور بہن کو کوڑا لادو۔ وہ اودھم سنگھ کی غداری  
 کی سزا اُس کی ماں اور بہن کو دینا چاہتا ہے۔ بدھ سنگھ کے حکم سے دس بارہ سکھ اُس  
 گاؤں کو روانہ ہو گئے تھے۔

سید احمد شہید نے ادھر سے اسماعیل کے ساتھ دس بارہ مجاہدین بھیج دیئے۔  
 ان میں ہمت خان بھی تھا۔ یہ جماعت جب اُس گاؤں میں پہنچی تو دماں خوف  
 ہراس طاری تھا۔ معلوم ہوا کہ بدھ سنگھ کے سپاہی پیسے پہنچ گئے ہیں۔ اسماعیل اور  
 مجاہدین بھاگ بھاگ پہنچے مکان کے باہر سکھ سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے  
 مجاہدین کو باہر ہی روک لیا اور ان میں غوریز معرکہ شروع ہو گیا۔ اسماعیل اور ہمت خان  
 مکان میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے مگر ناکام رہے۔ آخر دونوں کچھوڑنے  
 سے اندر گئے۔

اندر کا یہ حال تھا کہ اسماعیل کی ماں تلوار کے زخموں سے مری پڑی تھی اور  
 اُس کی بہن پر تیم کوڑے کے کپڑے پھٹے ہوئے اور بال کبھرے ہوئے تھے۔ اُس نے  
 بتایا کہ سکھ سپاہی اندر آئے اور پر تیم کوڑے کو کپڑے پھاڑنے لگے۔ ماں نے  
 تلوار نکال لی اور سکھوں پر حملہ کیا لیکن دو سکھوں نے اُسے ختم کر دیا۔ پر تیم کوڑے کو وہ  
 بے آبرو کرنا چاہتے تھے کہ باہر شور اٹھا۔ اندر والے سکھ باہر گئے اور اسماعیل اور

ہمت خان اندر چلے گئے۔ اس طرح پر تيم کور کی آبرو محفوظ رہی۔ اسماعیل اور ہمت خان کچھ پاڑے سے ہی پر تيم کور کو نکال لے گئے۔ مجاہدین میں سے دو تین شہید ہو گئے باقی نکل گئے۔

سید احمد شہید کے گاؤں میں لا کر اسماعیل نے اپنی بہن کو بتایا کہ وہ اب اودھم سنگھ نہیں اسماعیل ہے۔ اُس نے جب بہن کو بتایا کہ وہ کیوں مسلمان ہوا ہے تو بہن بھی مسلمان ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ سید احمد شہید نے اُسے مسلمان کر لیا اور اس کا نام زینب رکھا۔ زینب جوان لڑکی تھی۔ اسماعیل کی خواہش پر ہمت خان اور زینب کی شادی کر دی گئی۔ سید احمد شہید نے قندھار کے ایک مجاہد کی بیٹی کو اسماعیل سے منسوب کر دیا لیکن اسماعیل نے کہا کہ وہ اگلی لڑائی کے بعد شادی کرے گا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد سید احمد شہید نے اٹک پر حملہ کیا جو خادے خان والی ہنڈ کی نڈاری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ اسماعیل اس حملے میں شہید ہو گیا۔ قاضی عبدالعلیم اثر افغانی نے اپنی کتاب ”روحانی رابطہ“ میں لکھا ہے کہ سید احمد شہید نے اسماعیل کی لاش دیکھی تو اُن کے آنسو بہہ نکلے۔ انہوں نے کہا ”آخر میرے سچیلے نے شہادت کا سہرا باندھ ہی لیا“



## بالاکوٹ کے میدانِ جنگ میں

یہ داستانِ شہادت ۱۸۳۱ء کی ہے اور یہ سید احمد شہید اور اُن کے مجاہدین کی داستانِ شہادت ہے اور یہ ایمان فروشوں کی کہانی بھی ہے۔ میدانِ جنگ وادی کاغان تھا۔ معرکہ سکھوں اور مجاہدین اسلام کا تھا جس کے قاترین میں سید احمد شہید، مولوی اسماعیل شہید اور مولوی خیر الدین شہید تھے۔

۱۸۳۱ء کے سال کی ابتدا تھی۔ ہزارہ کے ہڑاٹی علاقے کے دروں میں بھوگڑ منگ کو خاص اہمیت حاصل تھی کیونکہ یہ شکاری کے سر پر تھا اور وہاں سکھوں نے چھاؤنی بنا رکھی تھی۔ درتے کے اندر سب لوگ ان کو خراج دینے پر مجبور تھے۔ سکھوں کو وہاں دیکھ کر جہاد کا دلولہ ایک بار پھر ابھر آیا اور فیصلہ ہوا کہ سکھوں پر حملہ کر کے انہیں یہاں سے نکال دیا جائے اور اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ درتے کے لوگ اب ”عشر“ مجاہدین کے لئے وقف کر دیں گے۔ چنانچہ مولوی اسماعیل کی سرکردگی میں چار سو غازیوں کا لشکر بھوگڑ منگ کی طرف بھیج دیا گیا۔ مولوی خیر الدین شیر کوئی نو نائب مقرر کیا گیا تھا۔ سکھوں نے مجاہدین کی آمد دیکھی تو شکاری کی گڑھی میں مقیم ہو گئے۔ مقامی لوگوں نے سکھوں کو خراج دینے سے انکار کر دیا اور بالیہ بخوشی مجاہدین کو دینا شروع کر دیا۔ مجاہدین نے اُن کو یقین دلایا کہ سکھوں نے ان کے خلاف کوئی اقدام کیا تو مجاہدین اُن کو روکنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس بنا پر درتے کے باہر چپقلش ہوتی رہتی تھی۔ بھوگڑ منگ کے بعد غازیوں کا



ایک دستہ سپہ سالار بھیج دیا گیا جو بھوگڑ منگ سے چند میل شمال میں واقع ہے۔  
جہاد کے آغاز کے لئے ضروری تھا کہ ارد گرد کے حالات کا جائزہ لیا  
جالتے اور جیب برہناری کا موسم ختم ہونے کا آغاز کیا جاتے۔ اس خطے میں  
بھی مسلمانوں میں نفاق اور تفریق کا مرض زوروں پر تھا۔ ان میں سے ایک  
گروہ نے سکھوں کی مدد سے اقتدار حاصل کر رکھا تھا اور دوسرا گروہ مارا  
مارا پھر رہا تھا۔ نجف خان گھوڑی والا اپنی ریاست سے نکل کر کوہ درابہ میں  
بیٹھا تھا۔ راجہ منصور خان والی ملک درابہ اپنے بھائی مظفر خان کے خوف سے  
چھپا پھر رہا تھا۔ حبیب اللہ خان مالک گڑھی اپنی زمینداری کو چھوڑ کر بالاکوٹ  
سے بھی آگے دیر کا خان میں مقیم تھا۔ ان سب مقہورین اور مغرورین نے سید احمد  
شہید سے دستگیری کی درخواستیں کی تھیں۔

سید احمد شہید نے مولوی اسماعیل اور مولوی خیر الدین کو بالاکوٹ کی تسخیر  
کے لئے منتخب کیا۔ بالاکوٹ ضلع ہزارہ کے کوہستانی علاقے وادی کا خان کے  
جنوبی دہانے پر واقع ہے۔ حسب الحکم ۲۷ شعبان ۱۲۶۴ بمطابق ۱۵ فروری ۱۸۴۱ء  
ظہر کے وقت مولوی خیر الدین بھوگڑ منگ سے روانہ ہوتے۔ یہاں سے  
بالاکوٹ تین کوس کے فاصلے پر تھا لیکن درمیان میں بڑا دشوار گزار پہاڑ تھا۔  
برف باری نے سفر کی مشکلات میں اضافہ کر دیا تھا۔ بایں ہمہ مولوی خیر الدین  
بالاکوٹ پہنچ گئے۔ خواہن کو مجاہدین کی نقل و حرکت معلوم ہوتی تو انہوں نے  
پیغام بھیجا کہ مظفر آباد کا نجف خان اپنے محسن بیکہ جنیل شیر سنگھ کے ساتھ باہر گیا  
ہوا ہے اور مظفر آباد خالی پڑا ہے۔ مولوی اسماعیل جسمانی طور پر خالص کمزور ہو  
گئے تھے۔ اکثر علیل رہتے تھے۔ پھر بھی بالاکوٹ جانے کے لئے تیار ہو گئے تاکہ  
مولوی خیر الدین کے ساتھ رہیں۔ دوسرے ہی دن بالاکوٹ پہنچ گئے، اگرچہ  
سفر کی تکالیف سے لاچار ہو گئے تھے۔

اس دوران معلوم ہوا کہ سکھوں کا لشکر بھوگڑ منگ پر حملہ کرنے کی غرض  
سے درے کے باہر جمع ہو رہا ہے۔ چنانچہ سید احمد شہید خود راج دواڑی  
سے سپہ سالار کے لئے روانہ ہوئے۔ ان کے ہمراہ تین چار سو مجاہدین تھے اور

۲۷ رمضان المبارک کو سپہ سالار پہنچ گئے۔ کاغان کا سید ضامن شاہ بیعت کے لئے  
جمع اقربا حاضر ہوا اور جہاد میں جان و مال سے شرکت کا عہد کیا۔ سلطان زبردست  
خان اور راجہ مظفر خان کے مشورے سے مجاہدین نے ایک لشکر مظفر آباد کی  
طرف روانہ کر دیا۔ یہ لشکر مولوی خیر الدین شیر کوٹی کے زیرِ نگرانی تھا۔ لاکھ پتہ لکھنؤ  
نگہ باری اور منصور خان قندھاری الگ الگ جیشوں کے سردار مقرر کئے  
گئے۔ اس طرح مجاہدین تین ٹولیوں میں منقسم تھے۔ غازیوں نے مظفر آباد پہنچتے  
ہی بازار پر اور زبردست خان کے محل پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں کے ہاتھ میں  
چھاؤنی اور گڑھی رہ گئی تھی۔

زبردست خان کو جب اس کا محل مل گیا تو اس نے سکھوں سے ساز باز  
شروع کر دی اور مجاہدین سے جس امداد کا وعدہ کیا تھا، اس میں ٹال مٹول کرنے  
لگا۔ منصور خان قندھاری اور قطب الدین ننگہ باری کو اس قدر غصہ آیا کہ انہوں  
نے چھاؤنی پر حملہ کر دیا جس سے مقصد یہ تھا کہ زبردست خان کی سازش کو ناکام  
بنا دیا جائے۔ سکھوں سے بڑی سخت جنگ ہوئی۔ آخر چھاؤنی پر مجاہدین کا قبضہ  
ہو گیا۔ یہ حملہ سالار لشکر مولوی خیر الدین کی اجازت کے بغیر ہوا تھا لیکن چھاؤنی  
پر قبضہ ہو جانے کے باعث یہ خطا معاف کر دی گئی۔ زخمی مجاہدین کو بالاکوٹ  
پہنچا دیا گیا۔ سید احمد شہید بھی وہیں تھے۔

کشمیر کے راستے پر مظفر آباد ایک اہم مقام ہے اس لئے اس پر سکھوں  
کا قبضہ گوارا نہیں کیا جاسکتا تھا مگر زبردست خان کے خدارانہ رویے کے  
باعث مجاہدین کی جماعت کو یہاں ٹھہراتے رکھنا دشمنی سے بعید تھا۔  
یوں فیصلہ کن جنگی اقدامات کے بہترین مواقع ضائع کر دیتے گئے۔ دراصل  
مجاہدین ابھی کسی جنگ کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ دور دراز کی مسافت طے  
کر کے جان لیوا مشقتوں سے اس مقام پر پہنچے تھے۔ تھکے ماندے تھے اور  
کچھ بیمار بھی تھے۔ اکثر موسم کی شدید سردی سے ڈھال تھے اور چاہتے تھے کہ کچھ  
دن اور سستائیں اور تازہ دم ہو جائیں۔ سامان جنگ بھی کافی نہ تھا۔ اس کا  
بیشتر حصہ وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے کیونکہ پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں سے

اسے اٹھا کر لانا ابھی اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ ایسے مقام کی بھی تلاش میں تھے جو دشمن کی نظر سے اوجھل اور ان کی لینا سے محفوظ ہو، حتیٰ کہ غازیوں کا اجتماع مکمل ہو جاتے۔ کاغان کے باشندوں کے احوال و اخلاق سے بھی ناواقف تھے۔ اُن کی عسکری قابلیت اور شجاعت کا راز ابھی ان پر نہیں کھلا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مظفر آباد کی جنگ میں مولوی خیر الدین بابر زبردست خان سے وعدے پورے کرنے کی درخواست کرتے تھے۔ مجاہدین اجنبی ملک میں تھے۔ وہاں کے باشندوں کی زبان سے بھی ناواقف۔ سامان جنگ بھی کافی نہ تھا۔ سکھوں کی برتری اور مسلمانوں پر اُن کے مظالم بھی نہیں دیکھے جاتے تھے۔

دشمن تیاری کی ہمت نہیں دیتا تھا۔ مجاہدین جن لوگوں اور روسا کا ساتھ دینے پر مجبور ہوتے تھے وہ شکست خوردہ تھے۔ کامیاب اور حکمران طبقے کے ساتھ ان کی گفتگو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو سکھوں کے رحم و کرم پر جی رہے تھے۔ ان میں کچھ سکھوں کے اہل بیت بھی تھے۔ سکھوں کا کھانے اور مجبور لوگوں پر اپنا رعب گناہتے تھے۔ پھر بھی مجاہدین کے فاتحین نے قدم جما لئے۔ مقامی آبادی کو ساتھ لانے کا وسیلہ مال و دولت ہو سکتا تھا جو مجاہدین کے پاس نہیں تھا۔ مظالم اور مفلسی نے انہیں اس قدر مجبور کر دیا تھا کہ وہ مجاہدین کا ساتھ دینے کے قابل نہیں تھے۔ مجاہدین اللہ تعالیٰ کے بھرپور جہاد کے لئے تیار ہو گئے۔ سکھوں کے ساتھ مسلح جوتی کی تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

شیر سنگھ اور نجف خان کو جب خبر ہوتی تو وہ گڑھی حبیب اللہ پہنچ گئے۔ زبردست خان نے مولوی خیر الدین سے پوچھا کہ وہ اب کیا کریں گے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ مجھے ان خطرات کا پہلے سے احساس تھا۔ اب بھی اس خطرے کی روک تھام ممکن ہے بشرطیکہ میرے لشکر کے لئے ضروری سامان فراہم کر دیں اور جو مقامات سخت خطرے میں ہیں وہ میرے حوالے کر دیں۔ زبردست خان صبح طلوع ہونے سے پہلے ہی فرار ہو گیا۔ مولوی

خیر الدین نے مجاہدین کو مظفر آباد سے واپس بلا لیا۔ شیر سنگھ نے بھی اپنا ارادہ بدل لیا اور بھوگڑ منگ اور سچون پر جہاں سید احمد شہید مقیم تھے جملے کی تیاری بنے لگا۔ مولوی صاحب نے خبر پا کر سید احمد شہید کو خبردار کر دیا اور خود گڑھی حبیب اللہ پر شیخون مارنے کی تیاریاں کیں جہاں شیر سنگھ مقیم ہو گیا تھا، لیکن سید احمد شہید نے تمام مجاہدین کو سچون طلب کر لیا۔ چنانچہ مجاہدین بالاکوٹ کو حبیب اللہ کے سپرد کر کے سچون چلے گئے۔

راجہ شیر سنگھ نے میدان خالی پا کر بالاکوٹ پر چڑھائی شروع کر دی۔ جب یہ لشکر دو کوس کے فاصلے پر رہ گیا تو حبیب اللہ خان نے سید احمد شہید سے مدد طلب کی۔ سید احمد شہید گل لشکر کے ساتھ بالاکوٹ چلے گئے۔ مجاہدین کی تھوڑی سی نفری کو سچون اور بھوگڑ منگ رہنے دیا گیا۔ مجاہدین کی خواہش تھی کہ جلد از جلد بالاکوٹ پہنچ جائیں مگر برباری اور دشوار گزار راستوں نے انہیں جلدی نہ پہنچنے دیا۔ سچون سے بالاکوٹ کا وہ راستہ جس پر دشمن کی آمد کا خطرہ نہ تھا بڑا ہی دشوار گزار تھا اور برف سے اٹ گیا تھا۔ سید احمد شہید نے گجروں کو ملازم رکھ کر برف ہٹانے پر لگا رکھا تھا۔ اس طرح یہ تھوڑا سا فاصلہ چار روز میں طے ہوا۔ ارباب مہرام خان شاکر کو ملیں مہرے ہوئے تھے۔ انہیں بھی سچون بلا لیا گیا تھا۔ ان کے ہمراہ بیس مجاہد تھے۔ سید احمد شہید ۱۶ مارچ ۱۸۳۱ء بروز امیتوار سچون سے بالاکوٹ گئے تھے۔

بالاکوٹ پہنچے تو سست بننے کے نالے پر اُن کا استقبال کیا گیا۔ وہاں خان کی جوبلی میں فروکش ہوئے جو مسجد بالا کے قریب تھی اور اُن کے لئے خالی کرائی گئی تھی۔ بالاکوٹ ایک قدرتی پُشتے یا ٹیلے پر ایک گنجان آباد قصبہ ہے۔ مکان چھوٹے چھوٹے اور گلیاں تنگ اور بیچ دار تھیں۔ یہ قصبہ کاغان، کیلاش، گلگت اور شمالی کوہستانی علاقوں کی تجارت کا مرکز تھا۔ اس کے جنوب مشرق میں دریائے کنہار بہتا ہے اور اس مقام پر کئی ایک پہاڑی نالے اس میں آکر گرے ہیں۔ وہاں ایک بل ڈال دیا گیا تھا۔ دو مین مسجدیں بھی تھیں۔ مسجد کلاں جنوب مغربی حصے میں تھی۔ اس بڑی مسجد میں صرف پچاس ساٹھ آدمی

نماز پڑھ سکتے تھے۔ سنت بنیت کے نالے پر کھڑے ہو کر مغربی سمت کو دیکھیں تو ایک بلند پہاڑ نظر آتا ہے۔ یہ شمال سے جنوب تک پھیلا ہوا ہے۔ شیر سنگھ کا لشکر دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر پڑا تھا اور بالا کوٹ سے کوئی دو اڑھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کنارے پر جانوروں کو چرانے کے لئے جگہ کافی نہیں تھی۔ اسی لئے وہاں بیل ڈال گیا تھا کہ جانوروں کو چرانے کے لئے مغربی کنارے پر لایا جاسکے۔۔۔ سید احمد شہید نے بالا کوٹ پہنچتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ بالا کوٹ کی طرف آنے والے راستوں کی ناک بندی کے لئے دستے مورچہ بند کر دیئے۔ پھر دفاعی مورچہ بندی کر دی گئی۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ سکھ لشکر دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر بالا کوٹ سے تین میل دور خمیر زن تھا، وہ اسی طرف سے حملہ کر سکتا تھا لیکن یہ آسان نہ تھا کیونکہ بالا کوٹ مغربی کنارے پر واقع ہے۔ مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے بالا کوٹ کے سامنے سکھ پہنچ سکتے تھے لیکن مغرب کی طرف بالا کوٹ کے محاذ پر آنا ان کے لئے ممکن نہ تھا کیونکہ راستے میں دشوار گزار پہاڑ حائل تھے۔

بالا کوٹ ایک محفوظ مقام ہونے کے متعلق سید احمد شہید نے ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء کے روز (شہادت سے گیارہ روز پہلے) نواب محمد وزیر خان ولی عہد ٹانک کو خط لکھا۔ یہ ان کا آخری خط تھا۔ انہوں نے اہل سمر کے جو روتہم اور پھر ہجرت کی تفصیل کے بعد لکھا۔ ”میں کچلی پہاڑوں پر آ گیا ہوں۔ یہاں کے باشندے حسن اخلاق سے پیش آتے اور جہاد میں اعانت کے پختہ وعدے کئے۔ جہاں قیام کے لئے جگہ دی۔ فی الحال قصبہ بالا کوٹ میں اطمینان سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ کفار کا لشکر بھی مجاہدین کے مقابلے کی غرض سے تین چار کوس کے فاصلے پر ڈیرے ڈالے ہوئے ہے۔ یہ مقام محفوظ ہے۔ خدا کے فضل سے ان کا لشکر یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں اگر مجاہدین پیش قدمی کریں تو جنگ ہو سکتی ہے۔ مجاہدین کا ارادہ ہے کہ چند دنوں کے بعد جنگ کی جائے۔ بارگاہ باری تعالیٰ سے امید ہے کہ فتح و نصرت کے

دروازے کھل جائیں گے۔ اگر تاخیر۔ بانی شامل حال رہی اور ہم اس جنگ میں کامیاب ہوتے تو انشاء اللہ دریائے جہلم سے کشمیر کے آخری سرے تک مجاہدین کا قبضہ ہو جائے گا۔ دن رات دین کی ترقی اور لشکر مجاہدین کی کامیابی کی دعا کرتے رہیں۔

سکھوں کو اس جنگ میں فتح کا یقین نہ تھا۔ پنجاب کے پولیٹیکل اسسٹنٹ سی۔ ایم۔ ڈیڈے نے گورنر جنرل کے سیکریٹری ایچ۔ پی۔ پرنسپ کو لکھا تھا۔ ”میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباری نامہ نگار کی رپورٹ کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ کنور شیر سنگھ اور بہمن سنگھ گورنر کشمیر کی طرف سے اطلاعات پہنچی ہیں کہ یہ خبر پاکر کہ سید احمد شہید دربار کے مقام پر ہیں جو پہاڑوں کے اندر بہت ہی محفوظ جگہ ہے، انہوں نے کوچ کیا اور جنگ کا آغاز کر دیا۔ سرکاری فوج چونکہ پہاڑوں کے اندر محفوظ مقامات اور دروں وغیرہ سے واقف نہیں تھی اس لئے بڑی طرح شکست کھا گئی۔ تین سو سکھ مارے گئے اور اتنے ہی زخمی ہوئے۔ انہیں جب یقین ہو گیا کہ جنگ جاری رکھنا ناممکن ہے تو سکھ فوج چھ سات کوس پیچھے ہٹ آئی اور خمیر زن ہو گئی۔ ان کا ارادہ جلد دوبارہ حملہ کرنے کا تھا لیکن ان کے کمپ کے اندر گندم قلت کی وجہ سے بہت مہنگی ہو گئی تھی اور ایک روپے کی پانچ سیر ملتی تھی۔“

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اس شکست کی اطلاع ملی تو اپنے جوٹشی سکون اور مددوین کو بلایا اور تمام واقعہ ان کو سنایا کہ حساب لگا کر بتائیں کہ کنور شیر سنگھ کامیاب ہو گا یا نہیں۔ انہوں نے حساب لگا کر جواب دیا کہ اچھی طرح سوچ کر اور ایک بار پھر دیکھ کر بتائیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فتح یقینی اور آسان نہیں۔

مغرب کی طرف جو دشوار گزار پہاڑ حائل تھا اس پر پرانے حملہ آوروں اور بادشاہوں نے فوجوں کے لئے ایک راستہ بنایا تھا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پر گھاس اور جھاڑیاں اُگیں اور راستہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہاں کے چند ایک باشندوں کو اس راستے کا علم تھا۔ سکھ راستے سے بالکل ہی

بے خبر تھے۔ وہاں آبادی بہت ہی کم تھی، اس لئے آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ پوشیدہ راستہ پہاڑ کے دوسری طرف تھا۔ یعنی بالاکوٹ کی طرف سے اس پر نقل و حرکت کی خبر ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ایک پہاڑی نالے کا بہاؤ تھا جو اوپر جا کر گنڈنڈی بن گئی تھی۔ شیر سنگھ بالاکوٹ کی تسخیر کو ناممکن سمجھ کر لاہور واپس جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس موقع پر چند ایک ایمان فروشوں نے انعام و اکرام کے عوض غداری کی اور سکھوں کو یہ راستہ بتا دیا۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے ساتھ لے گئے اور تمام راستہ اچھی طرح دکھا دیا۔ شیر سنگھ کی بالو سی مسرت میں بدل گئی اور واپسی ترک کر دی اور اس راستے پر کوچ کر دیا۔ یہ بالاکوٹ کی طرف پیش قدمی تھی۔ مجاہدین یہ سمجھ کر سکھ واپس جا رہے ہیں۔ سکھوں کی نقل و حرکت رات کو ہوتی تھی۔ انہوں نے توپیں اور شائینیں بھی ضرورت کے مقام پر پہنچا دیں۔ سردی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ پیلے ملا لال محمد قندھاری کو جس مورچے میں مقرر کیا گیا تھا وہاں سردی بہت ہی زیادہ تھی۔ اس کی جگہ دوسرا جیش بھیجا گیا جس کی کمان مرزا احمد بیگ کے ہاتھ تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں اس پوشیدہ راستے کا دھانہ اُگر کھٹا تھا۔ سکھوں کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ایک رات کے پچھلے پہر انہوں نے اچانک مرزا لال بیگ کے مورچے پر حملہ کر دیا۔ دشمن کی تعداد کی افراط کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مرزا اور اس کے مجاہدین نے جم کر مقابلہ کیا۔ اُس نے ایک قاصد سید احمد شہید کو اطلاع دینے کے لئے بھیج دیا۔ سکھوں کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی۔ آٹھ مجاہدین شہید اور بہت سے زخمی ہو گئے تو مرزا احمد بیگ بچے بچے چند ایک مجاہدین کو ساتھ لے کر مورچہ چھوڑ آئے۔ سکھوں نے وہاں پر قبضہ کر لیا۔

سید احمد شہید نے اطلاع ملتے ہی ایک جیش اُن کی مدد کے لئے بھیجا۔ دوسو مجاہدین مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچ گئے۔ یہ ٹیلہ پہاڑ کے دامن اور بالاکوٹ کے درمیان واقع تھا۔ سکھ اس قدر زیادہ تعداد میں تھے کہ مجاہدین کے لئے مزید پیش قدمی ناممکن ہو گئی۔ سکھوں کو غداروں نے ایسے راستے پر ڈال دیا تھا جس کے وہاں پر وہ پہنچے تو آگے انہیں کئی راستے مل گئے۔ مجاہدین بڑی

ہی قلیل نفری سے غوریز معر کے لڑے مگر سکھوں کو پیچھے نہ ہٹا سکے۔ سکھوں نے دریائے مغربی کنارے پر بھی قدم جمالتے تھے۔ وہ مشرقی کنارے پر بھی تھے۔ مجاہدین نے پل توڑ دیا۔ پھر بھی سکھوں کی پیش قدمی نہ روکی جاسکی کیونکہ ان کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی۔ مسجد کلاں کے ارد گرد تختوں سے مورچہ بندی کر لئی گئی۔

سید احمد شہید نے ملا لال قندھاری سے دریافت کیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سب بھیتے کے نالے ہو کر پہاڑ پر جاتیں اور سکھوں پر بخون ماریں؟۔ ملا نے جواب دیا: ”مدت سے اس ملک میں رہ کر لوگوں کا حال خوب دیکھ لیا۔ اس سے نفاق و درک کرنا مشکل ہے۔ یہی لوگ سکھوں کو راستہ دکھا کر لاتے ہیں“

”آپ نے درست کہا“ سید احمد شہید نے۔ ”ہم نے اس کا رخیر میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا۔ ہندوستان، خراسان، ترکستان میں اپنے نمائندے بھیجے۔ ہر جگہ دعوتِ جہاد پہنچائی۔ جہاں خود گئے وہاں وعظ و نصیحت کرتے رہے بہتر یہی ہے کہ اب سب مورچوں سے بھاتیوں (مجاہدین) کو بلا لیں۔ کل صبح اُس بالاکوٹ کے نیچے ہمارا اور گفار کامیباں ہو گا۔ اگر اللہ نے ہم عاجز بندوں کو ان پر فتح یاب کیا تو لاہور دیکھیں گے، شہید ہوتے تو جنت الفردوس“

★

جنگ کے لئے یہ تدبیر سوچی گئی کہ مٹی کوٹ سے اُتر کر ٹیلے اور قبضے کے درمیانی نشیب میں جب سکھ پہنچیں تو اُن پر حملہ کر دیا جاتے۔ اس نشیب میں زیادہ تر دھان کے کھیت تھے۔ ایک دو دن پہلے بارش ہو جانے سے زمین دلدل بن گئی تھی اور گزرنے کے قابل نہیں رہی تھی.... مجاہدین نے حسب دستور صبح کی نماز باجماعت ادا کی۔ سید احمد شہید نے اپنی مہرمنشی محمدی انصاری کے حوالے کر دی، اور سب مجاہدین جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ سورج نکل آیا تو سکھ مٹی کوٹ کے شمالی گوشے پر نمودار ہوئے۔ اُن کی بند و قوتوں کی گولیاں اور توپوں کے گولے مسجد بالا کے ارد گرد پڑ رہے تھے۔ سید احمد شہید نے تمام



سرداروں کو تاکہ کر دی تھی کہ سب مورچوں میں بیٹھے گولیاں چلاتے ہیں لیکن باہر نکل کر اُس وقت تک حملہ نہ کریں جب تک ہمارا دشمن آگے بڑھتا ہو انظر نہ آئے۔ کچھ وقت بعد سید احمد شہید بالائی مسجد سے کود کر مع اپنی جماعت کے نیچے والی مسجد میں جہاں ایک جماعت پہلے سے مورچہ بندی کر کے دشمن کو روکنے کے لئے مستعد ہو چکی تھی، آگئے۔ دشمن ابھی دلدل کو پوری طرح عبور نہ کر سکا تھا مگر بستی کے اس قدر قریب آچکا تھا کہ اُس کی گولیاں مسجد میں پہنچ کر نقصان پہنچانے لگی تھیں۔ سید احمد شہید مسجد سے نکل کر دلدل کے کنارے پر جا پہنچے۔ اب دونوں لشکروں کے درمیان دھان کے کھیت اور دلدل حائل تھی۔

کنارے سے ہنر بنی کنارے سے اور پہاڑ کی بلندی سے۔ فضا کا یہ عالم تھا کہ گولوں کے دھوئیں سے پُرجی تھی۔ کچھ دیکھنا اور پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ اسکا اندھا دھند گولیاں اور گولے چلا رہے تھے جن سے کئی سکھ بھی ہلاک ہو گئے۔ مجاہدین کے دم میں جب تک دم رہا وہ جواب دیتے رہے۔ آخر سب شہید ہو گئے اور میدان جنگ پر خاموشی طاری ہو گئی۔

مولوی جعفر علی نقوی جو سید احمد شہید کے محافظوں میں سے تھے، لکھتے ہیں — ”جناب حضرت امیر المومنین درہمہ جماعت از نظر من غائب شد۔“

یہ سانحہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ بمطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء بروز جمعہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ سید احمد شہید کو توپ کا گولہ سیدھا آگیا جس سے آپ کے جسم کے پرچھے اُڑ گئے۔ بہت سے مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا اور میدان سکھوں کے ہاتھ رہا۔ سکھوں نے بالا کوٹ پہنچ کر خوب لوٹ مار کی بمصوم آبادی کا قتل عام کیا۔ قصبے کو آگ لگا دی اور اس آگ میں اپنے مرے ہوئے سکھوں کی لاشیں جلا دیں۔ سکھوں کا لشکر وہاں چار روز مقیم رہا پھر اسے واپس بلا لیا گیا۔ اپنی پی۔ پی۔ پر نسیب کے ایک خط کا اقتباس جو ۱۸ مئی ۱۸۳۱ء کے روز لکھا گیا تھا یوں ہے — ”کنور شیر سنگھ کی طرف سے ایک ایلی پی پہنچا۔ اُس نے بیان کیا کہ سید احمد شہید نے تین چار ہزار لشکریوں کے ساتھ جوڑ زیادہ تر ملک کے کسانوں پر مشتمل تھا نالے کے بار بالا کوٹ میں اڑھ جالیا تھا۔ کنور شیر سنگھ نے دوپہر کے وقت پیش قدمی شروع کر دی اور اس علاقے کے زمیندار (خان خوانین) میری (شیر سنگھ کی) مدد کے لئے ساتھ تھے۔ پرتاپ سنگھ اٹاری والے کی فوج، رتن سنگھ گھرچکی اور دوسرے سرداروں کی فوجیں بھی ساتھ تھیں جن کی تعداد پانچ ہزار کے قریب تھی۔ اس لشکر نے نالے کو پا پیادہ پار کیا اور دشمن (مجاہدین) کو بے خبری میں جالیا اور اُن کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اب تلواروں سے دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ سید احمد بمع اپنے پانچ سو ساتھیوں کے قتل کر دیا گیا۔ ان

سکھوں نے مجاہدین پر گولیوں کی بارش تیز کر دی اور خطرہ پیدا کر دیا کہ تمام مجاہدین ان کی گولیوں کا نشانہ بن جائیں گے۔ البتہ قندھاریوں کی ایک جماعت دامن کوہ سے دشمن کے مینیم پر حملہ کر رہی تھی۔ اس جماعت نے زیادہ مجاہدین کی کمک کی درخواست کی کیونکہ اس وقت اُن کا زور بہت زیادہ تھا لیکن اُن کو مدد پہنچانا ممکن نہ تھا۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اب تو آٹے سامنے کی جنگ تھی۔ سید احمد شہید بسم اللہ۔ اللہ اکبر کہہ کر دلدل میں کود پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے دلدل سے پار ہو گئے۔ مجاہدین نے اپنے نائے کی یہ جرات دیکھی تو سب دلدل میں داخل ہو گئے اور پار جا کر اپنے نائے سے جا ملے۔ دست بدست معرکہ شروع ہو گیا۔ مجاہدین کے تہہ کا یہ عالم تھا کہ انتہائی قلیل تعداد کے باوجود دشمن کے پاؤں اکھاڑ دیتے۔ سکھوں کو ہلاک اور زخمی کرتے اُسے پہاڑ تک پہنچا دیا مگر پہاڑ پر چڑھنا دشوار تھا اور مجاہدین پر دوسری سمتوں سے بند و قتل کی گولیاں اور توپوں کے گولے مسلسل آ رہے تھے۔ سکھوں کے پاس نفری اور جنگی قوت کی افراط تھی۔ مشرقی کنارے پر سکھوں کا جو تلوہ پناہ تھا وہاں سے بھی گولہ باری ہو رہی تھی۔ اس طرح مجاہدین پر تین طرف سے آگ برس رہی تھی۔ دریلے کہناہ کے مشرقی

کے خیموں اور سامان پر قبضہ کر لیا گیا۔ باقی لوگوں نے بھاگ کر جان بچائی یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ انگریز بھی مسلمانوں کا دشمن تھا اور سکھوں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ سکھوں کی فتح کی خبر سن کر اس قدر خوش ہوا کہ اطلاع لانے والے کو سونے کا ایک ہار انعام دیا۔ ایک بگڑی دی اور دو شالیں۔ گو بند گڑھ کے گورنر فقیر امام دین کو حکم دیا کہ اس قلعے میں جتنی توپیں موجود ہیں انہیں باری باری گیارہ بار داغا جائے۔

شکست مکمل تھی اور کچھ وقت کے لئے مجاہدین کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ سید احمد شہید کے جسم کے متعلق کئی باتیں بناتی گئیں اور ہر ایک جماعت نے اسے اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ ان کی قبر بالا کوٹ میں بنائی گئی لیکن یہ معتقدین کے جذبات کو تسکین دینے کے لئے ہے ورنہ وہاں کچھ بھی نہیں۔ بعد میں ایک گروہ نے اس قبر کو زائرین سے پیسے بٹورنے کا ذریعہ بنا لیا۔ ایک کھٹر مسلمان جماعت نے سکھوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لئے مشہور کیا کہ سکھوں نے سید احمد شہید کی لاش جلا دی تھی۔ سکھوں نے اپنی نجیب فوج کو لتی کے لئے اور فقیر خاندان کی فقیری کو برقرار اور اپنے زیر رکھنے کے لئے مشہور کیا کہ سید احمد شہید کی لاش کو دو شالوں میں لپیٹ کر پورے احترام سے دفنایا گیا تھا۔ سکھوں نے اُن کی تصویر بنائی اور ان کے تقویٰ اور شجاعت کے تذکروں سے دفتر کے دفتر سیاہ کر دیتے، لیکن حق بات تو وہی ہے جو اُن کے محافظ مولوی جعفر علی نقوی نے کہی تھی کہ وہ یک بیک غائب ہو گئے۔ یہی صحیح ہے کہ توپ کا گولہ براہ راست لگنے سے اُن کے جسم کے پرچے اڑ گئے اور معلوم نہ ہو سکا کہ دفعہ کہاں گئے۔ البتہ رنجیت سنگھ ان کی شہادت کی خبر سے بہت خوش ہوا کیونکہ اُس کی حکومت کے لئے مجاہدین بڑی مصیبتوں کا باعث بنے ہوئے تھے۔

سید محمد اسماعیل اور بہرام خان کی لاشوں کو وہاں کے باشندوں

نے دفن کر دیا تھا۔ جو مجاہدین اس معرکے میں حصہ نہ لے سکے تھے یا جو اس میں زخمی ہوئے تھے اور جو زندہ رہے اُن کی تعداد ایک سو پچاس بتائی جاتی ہے۔ انہوں نے ہندوستان واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے مولوی نصیر الدین کو اپنا امیر مقرر کیا اور سید اکبر شاہ کے ہاں سٹھان چلے گئے۔ یہ لوگ تارک الدنیا اور مجاہدین کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ پٹھانوں میں سے جن قبائل نے اس جہاد میں حصہ لیا وہ یوسف زئی اور خٹک تھے جنہوں نے مہادری اور بے پناہ قربانیوں سے رنجیت سنگھ کی قوت کو پیرسبک کی جنگ میں اُدھ متوا کر دیا تھا۔

افراد کی کامیابی یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنا کام کرتے جاتیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لئے قربان کر دیں۔ مقصد کے لئے اگر رہروان سفر جذبہ ایشار کے ساتھ سفر طے کرتے رہیں تو منزل مل ہی جاتی ہے۔



## حسین ناگن

PDF

سکندرِ اعظم تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اُسے فاتح کی حیثیت سے ایسی شہرت ملی کہ اُسے کئی ایک روایات اور حکایات کا کردار بنالیا گیا۔ ان میں زیادہ مشہور یہ حکایت ہے کہ سکندرِ اعظم مرنے لگا تو اُس نے وصیت کی کہ میں مرجاؤں تو میرے ہاتھ تابوت سے باہر رکھنا تاکہ لوگوں کو یہ معلوم کر کے عبرت حاصل ہو کہ کئی ملک فتح کرنے کے باوجود میں دُنیا سے خالی ہاتھ جا رہا ہوں۔

اگر اُس کی ماں اولمپیا صرف روائتی ملکہ ہوتی تو سکندر دُنیا سے خالی ہاتھ بھی جاتا اور دُنیا میں کوئی اُس کے نام سے واقف بھی نہ ہوتا۔ صرف اُس کے ملک کے لوگ چند دن یاد رکھتے کہ شاہی خاندان کا ایک فرد مر گیا ہے۔ سکندر کو بادشاہ اُس کی ماں اولمپیا نے بنایا تھا اور اس مقصد کے لیے مقدونیہ کی اس غیر معمولی طور پر حسین عورت کو متعدد آدمی پراسرار طریقوں سے قتل کرانے پڑے تھے۔ یہاں تک کہ اس عورت نے اپنے خاوند فلیقوس (سکندر کے باپ) کو بھی قتل کر دیا تھا۔

وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ سکندر فاتح تو دُور کی بات ہے، بادشاہ بننے کے بھی قابل نہیں ہے۔ وہ شرمیلہ لڑکا تھا۔ جسمانی لحاظ سے وہ توانا تھا اور خوب دھبی لیکن ذہنی لحاظ سے اُس میں مستعدی اور جیتی تھی ہی نہیں۔ وہ جوان ہو گیا تو بھی اُس میں کوئی بہتر تبدیلی نہ آئی۔ اُسے صرف

urdunovelspdf.com

book.com/urdunovelspdf

کے استقبال کے لیے باہر نہیں آسکتا تھا۔

ملکہ اولمپیاں اپنے بیٹے کی عادتوں اور ذہنی رجحان سے واقف تھیں۔ اُس نے دریچے سے باہر جھانکا۔ سکندر ایرانی سفیر کو روکے کھڑا تھا اور کند ذہن اور کھلنڈرے لڑکوں کی طرح بیکار گیتوں میں لگا ہوا تھا۔ اولمپیاں یہ سوچ کر خود باہر آئی کہ شاہ فیلقوس کو پتہ چل گیا کہ اُس کا بیٹا سفارتی آداب کو نظر انداز کر رہا ہے تو وہ بگڑ جائے گا۔

ایرانی سفیر، اُس کے ساتھ آیا ہوا وفد اور محافظ اتنی حسین ملکہ کو دیکھ کر شرم ہو کر رہ گئے۔ نسوانی حسن کے لیے ایران بھی مشہور تھا مگر یونانی حسن نے اُن پر ہلسم طاری کر دیا۔ وہ اُس کے بیٹے

گھوڑوں کے ساتھ دلچسپی تھی۔ ماں باپ کا اکٹوتا بیٹا ہونے کی حیثیت سے اُسے باپ کے مرنے کے بعد مقدونیہ کا تخت و تاج سنبھالنا تھا مگر باپ اُس کی عادات سے پریشان رہتا تھا۔ ایک روز ایران کا سفیر اپنے محافظ گھوڑ سوار دستے کے ساتھ شاہ فیلقوس سے ملنے مقدونیہ آیا۔ یہ دوستانہ دورہ تھا۔ ایرانی سفیر ایران کے بادشاہ کی طرف سے بیش قیمت تحفے لایا تھا۔ سفیر محل کے قریب پہنچ گیا۔ سکندر کی ماں اولمپیاں نے سکندر کی تربیت کے لیے اُس کے دوست بطلمیوس سے کہا کہ سکندر جہاں کہیں ہے اُسے حکم کر ایران کے سفیر کا استقبال اُس طریقے سے کرے جس طرح اُسے سکھایا گیا تھا۔

سکندر باہر ہی کھڑا تھا۔ ایرانی سفیر محل کے دروازے پر آکر رُک گیا کہ کوئی اُس کے استقبال کو آئے۔ سفیر نے زرق برق لباس پہن رکھا تھا اور اُس کے محافظ دستے کے گھوڑے اعلیٰ نسل کے تھے سکندر کو بطلمیوس نے کہا کہ ملکہ نے کہا ہے کہ اپنے باپ کی جگہ سفیر کا استقبال کر دو۔ سکندر نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ محافظوں کے گھوڑوں کو اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ سفیر گھوڑے سے اُتر تو محافظ بھی اُتر آئے۔ سکندر کو یہ گھوڑے اتنے اچھے لگے کہ وہ ایک گھوڑے پر چڑھ بیٹھا۔ سکندر کا لباس معمولی سا تھا۔ محافظوں نے اُسے محل کا ملازم سمجھا اور اُسے ڈانٹ کر کہا کہ وہ گھوڑے سے اُتر جائے۔ کسی نے انہیں بتایا کہ یہ شاہ فیلقوس کا اکٹوتا بیٹا ہے۔ ایرانی سفیر نے اُس کی تعظیم کی اور سفارتی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُسے کہا کہ اُسے جو گھوڑا پسند ہے اُس پر سوار ہو جائے مگر ایرانی سفیر کے چہرے پر بالواسی اور ناپسندیدگی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ سکندر کے ہم عمر دوست بطلمیوس نے سکندر کے کان میں کہا کہ وہ مہمان اور اُس کے ساتھ آتے ہوئے آدمیوں کو دستور کے مطابق شراب پیش کرے مگر سکندر نے ایرانی سفیر کے ساتھ گھوڑوں کی باتیں شروع کر دیں۔ اُسے اندر چلنے کو بھی نہ کہا۔ شاہ فیلقوس تخت پر بیٹھا مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا۔ بادشاہ ایک سفیر

کا انوار پہن بھول گئے۔ اولمپیاں نے دستور کے مطابق سفیر کا استقبال کیا اور اُسے دیگر مہمانوں کے ساتھ اندر لے گئی۔ اولمپیاں نے سکندر کے کان میں کہا کہ مہمانوں کو شراب پیش کرو۔ سکندر نے ایسے انداز سے شراب پیش کی جو بالکل عامیانا تھا۔ وہ اس شاہی رسم سے واقف ہی نہیں تھا۔ ایرانی سفیر نے شراب قبول نہ کی اور کہا کہ وہ سادہ پانی پئے گا۔ یہ ناپسندیدگی کا اظہار تھا۔

مہمانوں کو شاہ فیلقوس کے دربار میں پیش کر کے اولمپیاں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے سکندر کو دہاں بلایا اور اُسے خوب ڈانٹا۔ اُس نے کہا ”تمہیں اپنے باپ کی جگہ بادشاہ بننا ہے مگر تم جیسے گونگا اور بہرے ہو۔ لڑکیوں سے زیادہ شرمیلے ہو۔ تمہارے دماغ میں گھوڑے ایسے سمائے ہیں کہ تمہیں کسی اور چیز کے ساتھ دلچسپی ہی نہیں۔ تمہارا دادا گھوڑوں کا سوداگر تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ تم پر دادا کی بدروح سوار ہے۔۔۔ اپنے آپ کو اس بادشاہی کے قابل بناؤ۔“

سکندر کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے ماں کی باتوں کی تکلیف دی ہے۔ اُسے تخت و تاج کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ اُس نے کبھی سوچا تھا کہ وہ بادشاہ بن کر دوسرے ملکوں پر فوج کشی کرے گا مگر اُس کی ماں اُسے



وہ مسحور کیے ہوئے انسان کی طرح بے بس اور مجبور تھا۔ وہ اُسے آدھے محل کو سانپوں سے بھر دینے سے بھی نہ روک سکا۔ جو نہی اولیاس دیکھتی تھی کہ اُس کا خاندان اُس کی کسی حرکت سے پریشان ہو رہا ہے تو وہ اپنے حسن اور زبان سے اُسے مسحور کر لیتی تھی۔

مھر سکندر پیدا ہوا۔ اولیاس نے ایک ایک کر کے تمام سانپوں کو مار ڈالا لیکن لوگ اُسے ”حسین ناگن“ ہی کہتے رہے۔ سکندر کا شعور بیدار ہوا۔ وہ باتیں کرنے اور سمجھنے لگا تو اولیاس نے دو چار عورتیں اور چند ایک آدمی انعام و اکرام اور اجرت پر رکھ لیے جنہیں اُس نے کہا کہ وہ اُس کے بچے کے کان میں ہر وقت یہ ڈالتے رہا کریں کہ وہ عظیم آدمی بنے گا اور وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہوگا۔ اولیاس نے ان عورتوں اور آدمیوں کو یہ فرض بھی سونپا کہ وہ اُسے بتاتے رہا کریں کہ بچہ ان کے ساتھ کیا باتیں کر رہا ہے اور اُس کا ذہن اُسے کس طرف لے جا رہا ہے۔

فلیقوس نے دیکھا کہ اُس کے بچے کو ماں نے اپنا قیدی بنالیا ہے اور اُس کے ذہن کو کسی خاص سانچے میں ڈھال رہی ہے تو اُسے فکر پیدا ہوا کہ بچے کی ماں بچے کو اپنے جیسا پُر اسرافتہ بنا رہی ہے اور اگر بچے کا ذہن ماں کی خصلت کے سانچے میں ڈھل گیا تو یہ مقدونیہ کے تخت و تاج کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ چنانچہ اُس نے بچے کو ماں سے الگ کرنے کے طریقے اختیار کرنے شروع کر دیئے مگر بچہ باپ کے پاس جاتا تو ماں بھی جاکر پہنچتی اور بچے کو باپ کے اثر سے محفوظ رکھتی۔ باپ کو بچے کے ساتھ اتنا ہی پیار تھا جتنا ماں کو تھا۔

باپ آخر باپ تھا، مرد تھا اور بادشاہ بھی تھا۔ اُس نے سکندر کو اُس عبادت گاہ میں بھیج دیا جہاں استاد زماں ارسطو طب اور حکمت کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ یہ عبادت گاہ شہر سے دس گیارہ میل دور تھی۔ ارسطو نے شاگردوں کو تعلیم دینے کے لیے یہ عبادت گاہ اس لیے پسند کی تھی کہ شہر کے ہنگاموں سے دور تھی اور وہاں عبادت کے لیے کوئی نہیں جاتا تھا کیونکہ

تخت کے لیے تیار کر رہی تھی۔ یہ ایک جنون تھا جو یونان کی اس انتہائی حسین عورت کے دماغ پر آسیب کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ یہ جنون سکندر کی پیدائش سے پہلے کا تھا۔ اولیاس اکثر کہا کرتی تھی کہ وہ ایک بیٹے کو جنم دے گی جو مقدونیہ کا بادشاہ ہوگا۔ وہ قبل مسیح کا دور تھا جب انسان تو ہم پرست تھا۔ یونان نے تو خیالی دیوتا تخلیق کر رکھے تھے۔

اولیاس کے خیالات اور عقیدے بھی ایسے ہی تھے۔ اُس نے بہت سے سانپ پالنے شروع کر دیئے اور محل کا ایک حصہ سانپوں کے لیے وقف کر دیا۔ انہیں وہ اپنے ہاتھوں دودھ پلاتی اور خوراک کھلاتی تھی۔ محل کے اس حصے کے قریب سے بھی کوئی نہیں گزرتا تھا لیکن اولیاس ان ریگتے ہوئے سانپوں میں گھومتی پھرتی تھی۔ مکروں میں برآمدوں اور غلام گردشوں میں سانپ ریگتے پھرتے یا گندلی مارے سو رہے ہوتے تھے۔ لمبے باغیچے میں بودوں کی بیلوں کے ساتھ سانپ لیٹے ہوتے تھے۔ یہاں سے کوئی سانپ بھاگ کر کہیں جاتا نہیں تھا کیونکہ یہاں انہیں بڑی اچھی خوراک ملتی تھی۔ اولیاس نے سن رکھا تھا کہ پیٹ میں بچہ ہو تو وہ اُس ماحول سے متاثر ہوتا ہے جس میں اُس کی ماں رہتی ہو۔ چنانچہ اولیاس نے اپنے ماحول کو سانپوں سے بھر دیا۔ وہ اپنے ہونے والے بچے میں سانپوں والی خصلتیں پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ یہ کہ جس طرح وہ خود اتنے زہریلے اور خطرناک سانپوں میں بیوقوف گھومتی پھرتی رہتی ہے، اسی طرح اس کا ہونے والا بچہ بھی نڈر ہوگا۔ اس عورت نے اپنے آپ کو نڈر بنالیا تھا۔ سانپ پالنے اور ان میں رہنے کی وجہ سے وہ ”حسین ناگن“ کے نام سے مشہور ہو گئی۔

اولیاس کا خاندان فلیقوس اس کے بے مثال حسن سے متاثر ہوا اور اس کے ساتھ شادی کر بیٹھا تھا۔ شادی کے بعد اُس نے دیکھا کہ اس جوان لڑکی کی خوبصورتی طلسم ہوش رہا ہے اور پُر اسرار بھی۔ اُس کا ذہن سازش ساز تھا مگر اس کا جو طلسم فلیقوس پر طاری ہو چکا تھا، اُس کے آگے

یہ عبادت گاہ ویران ہو گئی تھی۔ ارسطو کو جو سکون وہاں میسر تھا وہ کسی محل میں بھی نہیں مل سکتا تھا۔ سکندر کو تعلیم کے لیے باپ نے وہاں بھیج دیا۔ ماں اُسے روک نہیں سکتی تھی۔ بچے کو تعلیم تو دینی ہی تھی، لیکن وہ مطمئن نہیں تھی۔ وہ بچے کو کوئی اور تعلیم دینا چاہتی تھی۔

دو تین ماہ بعد مقدونیہ کے ایک سرحدی قبیلے نے بغاوت کر دی۔ شاہ فیلقوس فوج لے کر بغاوت کو کچلنے کے لیے چلا گیا۔ اولمپس کو موقع مل گیا۔ وہ ایک رات کسی کو بتائے بغیر اس ویران عبادت گاہ میں چلی گئی جہاں اُس کا بیٹا ارسطو کے پاس پڑھتا اور وہیں رہتا تھا۔ وہ ارسطو سے تنہائی میں ملی اور اس عظیم فلسفی اور منکر پر ایسا جادو چلایا کہ وہ اس عورت کی بات مان گیا۔ اولمپس نے اُسے کہا تھا کہ اُس کے بچے کو وہ فیلقوس کی خواہش کے مطابق فلسفے اور طب کی تعلیم نہ دے بلکہ اسے بہترین حکمران اور سیاست دان بننے کے جوہر بتا دے۔ ارسطو نے سکندر کو وہی تعلیم دی جو اُس کی ماں نے تجویز کی تھی۔

سکندر سولہ سال کی عمر میں تعلیم لے کر عبادت گاہ سے واپس آ گیا۔ اُس میں جہاں اور تبدیلیاں آئیں وہاں سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی کہ وہ ارسطو کو دنیا کا عظیم انسان اور قابل احترام تالیق ماننے لگا مگر اُس کی تمام تر دلچسپیاں گھوڑوں کے ساتھ وابستہ ہو گئیں حکومت اور سیاست کے گرجانے کے باوجود اُس نے ادھر توجہ نہ دی کہ اُسے باپ کا جانشین بننا ہے۔ اس کی ماں بہر حال خوش تھی کہ اُس کے بیٹے نے ماں کے عزائم اور خواہشات کے مطابق تعلیم و تربیت حاصل کر لی تھی، لیکن ماں اسی سے مطمئن نہ تھی۔ وہ سکندر کو تمام انسانوں سے بلند و برتر بنانے کا متمنہ کیے ہوئے تھی۔ اس کا اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنے محل کی خادماؤں کو بڑی ہی رازداری سے بتایا کہ سکندر اُس کے خاوند فیلقوس کا بیٹا نہیں بلکہ وہ ایک دیوتا شہزخاف کا بیٹا ہے جو ایک خوبصورت اور زہریلے ناگ کے رُوپ میں اُس کے پاس آیا تھا۔

اُس زمانے میں یونان کے لوگ دیوتاؤں کے وجود کے قائل تھے اور وہ اس افسانوی مفروضے کو بھی سچ مانتے تھے کہ کسی دیوتا کو کوئی عورت پسند آجاتی ہے تو وہ اُسے اپنے پاس بلا لیتا ہے یا کسی دنیاوی رُوپ میں اُس کے پاس آ جاتا ہے۔ یونان کی دیوی لائی داستانوں میں دنیا کی عورتوں کے ساتھ دیوتاؤں کے عشق و محبت کی کئی داستانیں ملتی ہیں۔ اولمپس نے سکندر کے متعلق یہ مشورہ کیا کہ وہ دیوتا کا بیٹا ہے تو سنسنے والوں کو فوراً یقین آ گیا۔ اولمپس نے یہ بات اپنی خادماؤں کو رازداری سے اس لیے بتائی تھی کہ عورت بات پھیلانے کی عادی ہوتی ہے چند دنوں میں سارے ملک میں مشہور ہو گیا کہ سکندر فیلقوس کا نہیں دیوتا شہزخاف کا بیٹا ہے۔

فیلقوس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اُس کی بیوی اپنے بیٹے کو ناقابل فطرت انسان کے رُوپ میں پیش کر رہی ہے اور اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عورت فیلقوس کی زندگی میں اپنے بیٹے کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کرے فیلقوس کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اُس نے سکندر کو ارسطو کے پاس جس تعلیم کے حصول کے لیے بھیجا تھا اس کی بجائے وہ کوئی اور تعلیم حاصل کر کے آیا ہے اور یہ اس کی ماں کے کہنے پر عمل ہوا ہے فیلقوس نے اپنے بیٹے کو ماں کے بد اثرات سے بچانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ یہ مشہور کر کے کہ سکندر کی طرف سے دشمن کے حملے کا خطرہ ہے، اپنی فوج کو لے کر سکندر کی طرف چلا گیا اور سکندر کو بھی جنگی تربیت دینے کے بہانے ساتھ لے گیا۔

فوج کو سکندر کے کنارے خمیر زن کر دیا اور فیلقوس اپنے بیٹے کا مشاہدہ کرنے لگا کہ اس کا ذہن کس طرف جارہا ہے۔ ایک قلوپڑہ مصر کی ملکہ تھی جو فرعونوں کے خاندان سے تھی۔ ایک قلوپڑہ یونان کی بھی تھی جس کے حسن کے چمچے دُور دور تک تھے فیلقوس کی فوج سکندر کے کنارے خمیر زن بھی۔ ایک رات فیلقوس اپنے خیمے میں شراب سے

کاتا کرتی۔

سکندر نے اپنے باپ کو پیغام بھیجا کہ ماں محل سے چلی گئی ہے اور اب قبرستان کے ایک جھونپڑے میں رہتی اور عبادت میں وقت گزارتی ہے۔ فیلقوس کو تو یہ خطرہ نظر رہا تھا کہ اولپیاں محل سے نہیں نکلے گی اور اس کا جنبا حرام کر دے گی۔ وہ اپنے بیٹے کے پیغام سے بہت خوش ہوا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ محل میں واپس آگیا۔ اُس نے اپنے مخبروں سے اولپیاں کے متعلق معلوم کیا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کرتی ہے۔ مخبروں نے بتایا کہ وہ جھونپڑے میں بیٹھی رہتی ہے۔ اُسے شہر میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ فیلقوس کی بیوی قلوپڑہ اُس کے ساتھ محل میں آگئی۔ قلوپڑہ کا چچا اٹالوس بھی ساتھ آیا اور محل میں رہنے لگا۔ فیلقوس نے سکون کا سانس لیا کہ ایک فتنہ پرور اور پراسرار بیوی سے نجات ملی۔ فیلقوس یہ نہ دیکھ سکا

کہ جس بیٹے کی خاطر اُس نے اولپیاں کو طلاق دی ہے، وہ بیٹا قلوپڑہ اور اُس کے چچا کی نفرت کا مرکز بن گیا ہے۔ یہ دونوں سکندر کو تخت کے نااہل آوارہ اور گندہ بن ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اس کے ساتھ بات ہی نہ کرتے۔ اگر کرتے بھی تو ان کی بات میں طنز اور حقارت ہوتی تھی۔ سکندر اُن کے رویے اور نیت کو بھانپ گیا۔ وہ اب بچہ نہیں تھا مگر اُس کے باپ پر قلوپڑہ کے حسن کا جادو سوار تھا۔ وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔

ایک رات محل میں بہت بڑی ضیافت تھی۔ سکندر بھی موجود تھا۔ شراب کا دُور چل رہا تھا مگر سکندر نہیں پی رہا تھا۔ قلوپڑہ اور اُس کے چچا جانتے تھے کہ سکندر شراب نہیں پیتا اور یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ سکندر کے خیالات کی پرواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ قلوپڑہ نے مہمانوں کے سامنے سکندر کو شراب پیش کی۔ سکندر نے انکار کر دیا۔

”تم اجداد جنگی ہو۔ قلوپڑہ کا چچا سکندر پر برس پڑا۔“ دیوتا زوس کو قربانی دیتے ہو تو اُس کے بُت کے قدوں میں اپنے ہاتھوں شراب اندیٹے ہو اور محل میں کہتے ہو کہ تم شراب نہیں پیتے۔ کیا تم مقدونیہ کا بادشاہ بننے

دل بہلا رہا تھا۔ خیمے کا پردہ اٹھا اور ایک ایسی عورت خیمے میں داخل ہوئی جس کی خوبصورتی اسی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ فیلقوس کو معلوم ہوا کہ وہ شراب کچھ زیادہ پی گیا ہے جس کے اثر سے اُسے اتنے حسین دیکھنے نظر آنے لگے ہیں۔

قلوپڑہ اُس کے سپہوں میں جا بیٹھی۔ فیلقوس نے اُس کے جسم کو محسوس کیا تو اُسے یقین آیا کہ یہ واہرہ نہیں، گوشت پوست کی عورت ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں فیلقوس نے فوج کو خیموں سے نکال کر شراب کے ٹکے کھول دیے اور اعلان کیا کہ آج فوج جشن منائے گی۔ صبح تک سپاہی ناچتے گاتے اور شراب پیتے رہے۔ فیلقوس نے قلوپڑہ کو اپنے خیمے میں رکھا۔ دن جب فیلقوس کو ہوش آیا تو اُس نے سکندر سے کہا کہ تم میرے قائم مقام بادشاہ ہو۔ واپس چلے جاؤ اور میری واپسی تک حکومت کا کاروبار چلاؤ۔

سکندر چلا گیا۔ چھ ماہ تک فیلقوس اپنی فوج کے ساتھ سمندر کے کنارے رہا اور قلوپڑہ کو اُس نے اپنے ساتھ رکھا۔ ایک روز فیلقوس کا ایک قاصد رازداری سے سکندر کے پاس گیا اور اُسے باپ کا یہ پیغام دیا۔ ”میرے عزیز بیٹے! میں نے اٹالوس کی بھیجی قلوپڑہ کے ساتھ شادی کر لی ہے اور تمہاری ماں کو میں اب اپنی بیوی نہیں سمجھتا۔ میں نے تمہاری بہتری کی خاطر تمہاری ماں سے قطع تعلق کیا ہے۔ تم تخت کے وارث ہو۔ تمہیں اپنی ماں کا افسوس نہیں ہونا چاہیے۔“

سکندر اس خفیہ پیغام کو اپنی ماں سے چھپانہ سکا۔ اولپیاں کے لیے یہ ضرب بڑی سخت تھی لیکن اُس نے نہ احتجاج کیا نہ کسی ردِ عمل کا اظہار کیا۔ وہ اپنے بیٹے کو ساتھ نہیں لے جاسکتی تھی۔ لے جانا چاہتی بھی نہیں تھی کیونکہ اس کا بیٹا مقدونیہ کے تخت کا وارث تھا۔ اولپیاں نے یہ عجیب و غریب حرکت کی کہ شہر سے ذرا ہی دُور ایک پرانا قبرستان تھا جس کے درمیان ایک بہت پرانا جھونپڑا کھڑا تھا۔ اولپیاں محل اور اپنے بیٹے کو خیر باد کہہ کر اس جھونپڑے میں چلی گئی۔ وہاں وہ عبادت کرتی اور موت

کے قابل ہو؟ نہیں۔ تم اس قابل نہیں ہو۔ سکندر خاموشی سے سنتا رہا۔  
قلو پٹرہ کے چچا نے شراب کے نشے میں یہ بھی کہہ دیا۔ ”قلو پٹرہ ایک  
بچے کو جہنم دے گی اور وہ مقدونیہ کے تخت کا وارث ہوگا۔“

سکندر نے قریب پڑا ہوا شراب کا ایک پیالہ اٹھایا اور اطالوس  
(قلو پٹرہ کے چچا) کے سر پر پوری طاقت سے مارا۔ اطالوس چپکرا کر گر ا۔

قلو پٹرہ ددڑی آئی۔ سکندر نے اُس کے منہ پر بھر پور تھپڑ مارا۔ وہ بھی تورا  
کر گری۔ محفل پر ستاٹا طاری ہو گیا۔ سکندر کا باپ غصے سے اٹھا اور ایک  
محافظ کی کمر سے تلوار پھینچی۔ سکندر خالی ہاتھ تھا۔ کھڑا رہا۔ کوئی اس کے قریب  
نہیں آتا تھا۔ وہ غصے سے پھینکا رہا تھا۔ فیلقوس تلوار تانے سکندر پر  
دار کرنے آیا تو اُس کے قدم ڈمگا گئے کیونکہ وہ بہت زیادہ پی گیا تھا۔  
سکندر اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کا باپ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔

سکندر اپنے باپ کو اٹھانے کی بجائے ایک سٹول پر کھڑا ہو گیا اور  
محفل کے حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”آپ سب بلند عہدوں اور  
زمتوں کے لوگ ہیں۔ ملک کی قسمت اور مستقبل آپ کے ہاتھ میں ہے۔  
کیا آپ اس شخص کو جو میرا باپ ہے، اس قابل سمجھتے ہیں کہ یہ ایشیا کو فتح  
کرے گا؟ یہ بادشاہ جو تلوار اٹھا کر دو قدم بھی نہیں چل سکتا، صرف مقدونیہ  
کے تخت و تاج کو سنبھالنے کے قابل نہیں۔ دیکھ لو اسے۔ شراب نے  
اسے کس طرح گرا دیا ہے۔“ اُس نے قلو پٹرہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔  
”اس کی نئی بیوی کو دیکھو۔ اس کے شہنشاہ اور اس کے ناز و نخروں نے فیلقوس  
جیسے جابر جنگجو کو کس طرح بیکار کر دیا ہے۔ میرے بزرگو! عبرت حاصل  
کرد۔ میں کیوں شراب نہیں پیتا۔ صرف اس لیے کہ میں پاؤں پر کھڑا رہ سکوں۔  
میں آپ کو ایشیا کی حکمرانی دینے کا عزم لیے ہوئے ہوں۔ میں اپنے باپ  
کے تخت پر بیٹھ کر شراب نہیں پینا چاہتا اور نئی بیویوں کی زنجیروں کا قیدی  
نہیں بنوں گا۔“

فیلقوس بے ہوش پڑا رہا۔ اعلیٰ حکام اور مہمانوں سے بھری ہوئی محفل  
پر ستاٹا طاری رہا۔ کوئی بھی اس نوجوان کا سامنا نہ کر سکا۔ نوجوان سکندر محفل  
سے نکل گیا۔ اُس کا رخ اُس قبرستان کی طرف تھا جہاں ایک جھونپڑے میں  
اُس کی ماں اولپیس اس رہتی تھی۔ وہ جھونپڑے تک پہنچا تو اُس کی ماں باہر  
کھڑی تھی۔ جو حق دیرانے اور صدیوں پُرانے قبرستان میں کھڑی اولپیس اس  
جنت کی مخلوق گنتی تھی۔ وہ اب ملکہ نہیں، سیدھے سادے لباس میں  
عام سی عورت تھی۔ اس سادگی میں اُس کا حسن نکھر آیا تھا اور پُر اسرار بھی ہو  
گیا تھا۔ اپنے بیٹے کو دیکھ کر وہ باہیں پھیلانے ہوئے آگے بڑھی، اُسے  
گلے لگایا اور اُس کی پیشانی کو چوما۔

”میرے بیٹے!“ اولپیس نے سکندر سے کہا۔ ”تم نے طاعون  
کے سر پر شراب کا پیالہ توڑ کر شاید اچھا نہیں کیا۔“

سکندر نے حیرت سے اُسے دیکھا اور پوچھا۔ ”ماں! تمہیں اتنی  
جلدی کیسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں نے اطالوس کے سر پر شراب کا پیالہ  
مارا ہے؟“

”مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ تمہارا باپ تلوار تانے تم پر لپکا تھا مگر  
گر پڑا۔“ اولپیس نے مسکرا کر کہا۔ ”اور تم نے وہاں کے لوگوں سے  
جو کچھ کہا تھا وہ مجھ سے لفظ بہ لفظ سن لو۔ میں اس جھونپڑے میں رہتی ہوں  
لیکن مقدونیہ کا تخت و تاج میرے سائے سے آزاد نہیں۔“  
سکندر کو یوں لگا جیسے اُس کی ماں میں کسی دیوتا کی رُوح داخل ہو گئی

ہو یا وہ جادوگر بن گئی ہو۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کی ماں ظاہری طور  
پر تارک الدنیا ہو گئی تھی لیکن محل کے خادموں، خادماؤں اور چندا اور اہم افراد  
پر اُس کا جو غلبہ، اثر و رسوخ اور سحر طاری تھا وہ بدستور قائم تھا۔ اُس کے  
پاس ان لوگوں کو معاوضہ اور انعام و اکرام دینے کے لیے بہت کچھ تھا  
جو اُس نے جھونپڑے میں دبا رکھا تھا۔ ان لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ اولپیس  
کے سحر کا یہ اثر بھی ہے کہ جس کے ہاتھ سے جسے چاہے قتل کرا سکتی ہے۔



وہ تھی تو جھونپڑے میں مگر محل کی ایک ایک خبر فوراً اُس تک پہنچ جاتی تھی۔ سکندر جب قبرستان میں داخل ہوا تھا تو اُسے معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ایک آدمی اُس کی ماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سکندر کے قدموں کی آواز سُن کر اور اُس کی ماں کو پوری خبر سُن کر دوسری طرف سے چلا گیا تھا۔

”ماں!“ سکندر نے کہا۔ ”میں محل میں نہیں رہوں گا۔ مجھے اپنے ساتھ رکھ لو۔“

”میرے نادان بیٹے!“ ماں نے اُس کے گال پر تھکی دے کر کہا۔ ”میں تمہیں صرف مقدونیہ کا نہیں، آدھی دُنیا کا فاتح اور بادشاہ بنانا چاہتی ہوں مگر تم نے فرار کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ دشمنوں کے درمیان رہو اور اُن کا مقابلہ کرو۔۔۔۔ آج رات میرے پاس رہو۔ مجھے سوچنے دو۔“

سکندر اپنی ماں کے پاس سو گیا۔ صبح جھونپڑے کے دروازے پر کوئی سکندر کو آوازیں دے رہا تھا۔ سکندر باہر نکلا۔ اُس کا بڑا ہی گہرا دوست بطلمیوس آیا تھا۔ اولمپیاں بھی باہر نکل آئی اور بطلمیوس سے پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ شاہ فیلقوس نے اُسے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ سکندر اپنی ماں کے پاس گیا ہوگا۔ اُسے واپس لے آؤ۔

”وہ اپنے بیٹے سے انتقام لینا چاہتا ہے۔“ اولمپیاں نے کہا۔

”رات میرے بیٹے نے اُس کی بیوی اور اُس کے چچا کی بہت توہین کی تھی۔“

”نہیں۔“ بطلمیوس نے جواب دیا۔ ”شاہ فیلقوس اپنے بیٹے کے لیے پریشان ہیں۔ وہ غصے میں نہیں پریشانی کی حالت میں ہیں۔“

سکندر نے کہا کہ وہ نہیں جائے گا۔

”تمہیں وہیں جانا ہے میرے بیٹے!“ اولمپیاں نے کہا۔

”دیوتاؤں اور دیوتاؤں کے ہاتھ تمہارے سر پر ہیں۔ میں تم سے دور ہوں گی لیکن میری آنکھیں محل کی دیواروں کو بھٹا کر تم پر لگی رہیں گی۔“

کان محل کے اندر کی سرگوشیاں سنتے رہیں گے۔“ اُس نے سکندر کو اپنے بازوؤں میں لے کر کہا۔ ”میرے بیٹے کو کسی نے بدعتی کی آنکھ سے دیکھا تو یہ آنکھ اُس کے چہرے پر نہیں رہے گی۔۔۔۔ تم چلے جاؤ سکندر! اپنی ماں کو اپنے ساتھ سمجھو۔“

سکندر اپنے دوست بطلمیوس کے ساتھ چلا گیا۔ اولمپیاں جھونپڑے میں رہی اور اُسے محل کی خبریں ملتی رہیں۔ سکندر اپنے باپ کے سامنے گیا تو باپ نے اُسے گلے لگایا اور اتنے پیار کا مظاہرہ کیا جیسے رات کا واقعہ اُس کے ذہن سے اُتر گیا ہو۔ سکندر کو اطمینان ہو گیا کہ باپ اُسے سزا نہیں دے گا۔

دو روز بعد اولمپیاں رات کے وقت اپنے جھونپڑے میں لیٹی ہوئی تھی۔ نہایت آہستہ سے جھونپڑے کا دروازہ کھلا۔ اولمپیاں اُٹھ بیٹھی اور بولی۔ ”کیا خبر لائے ہو؟“

”سکندر کی جان خطرے میں ہے۔“ جھونپڑے میں داخل ہوئے والے نے کہا۔ ”شاہ فیلقوس نے سکندر کو دھوکہ دیا ہے کہ سکندر نے محفل میں اطالوس اور قلوپٹروہ کی جو بے عزتی کی تھی اُس کی شاہ فیلقوس کو کوئی پرواہ نہیں۔ ان تینوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سکندر کو کھانے میں زہر دے دیا جائے۔ شاہ فیلقوس کے دل اور دماغ پر قلوپٹروہ کا مکمل قبضہ ہے۔ جس روز سکندر نے اکیلے کھانا کھایا، اُس کے کھانے میں زہر ملا دیا جائیگا۔“

اولمپیاں نے سر ہلایا اور بولی۔ ”تم چلے جاؤ۔“

تین چار روز بعد ویسی ہی ایک ضیافت تھی جس میں سکندر نے اطالوس کے سر پر شراب کا پیالہ توڑا اور قلوپٹروہ کو تھپڑ مارا تھا۔ زہر خورد اور شراب کی محفل گرم تھی۔ شاہ فیلقوس قلوپٹروہ کو اپنے ساتھ بٹھائے ہوئے تھا۔ اچانک سکندر کی عمر کا ایک نوجوان فیلقوس کے سامنے گیا۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اُس نے خنجر کا ایک وار فیلقوس کے دل پر کیا اور دوسرا پیٹ پر کر کے پیٹ چاک کر دیا۔ شاہ فیلقوس اُٹھا، گرا پھر بھی نہ

اٹھ سکا۔ محفل سے دو تین آدمی خنجروں سے قاتل پر ٹوٹ پڑے اور اُسے زین ختم کر دیا۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس نوجوان نے کیوں اور کس کے کھنسنے پر شاہ فیلقوس کو قتل کیا ہے۔ وہ بھی قتل ہو چکا تھا۔ یہ قاتل اولپیاں کا بھیجا ہوا تھا اور قاتل کو قتل کرنے والے بھی اولپیاں نے بھیجے تھے تاکہ یہ پتہ ہی نہ چل سکے کہ قاتل کون ہے۔

سکندر اُسی وقت اپنی ماں کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ اُس کا باپ قتل ہو گیا ہے۔

”اور قاتل بھی قتل ہو چکا ہے۔“ اولپیاں نے کہا۔ ”میں نے انتقام کر دیا تھا کہ وہ زندہ نہ رہے تاکہ کسی کو پتہ نہ چل سکے کہ تمہارے باپ کو میں نے قتل کرایا ہے۔“

”یہ تم نے بہت بُرا کیا ماں!“ سکندر نے کہا۔

”میں نے جو کچھ کیا، اچھا کیا یا بُرا کیا، صرف تمہارے لیے کیا ہے بیٹا!“ اولپیاں نے کہا۔ ”مقدونیہ کا تاج تمہارے سر پر رکھنے کے لیے میں اب تک دس آدمی قتل کر چکی ہوں۔ یہ قتلویہ کے چاہنے والے تھے۔ ان کی مدد سے وہ تمہیں تخت کی وراثت سے محروم کر رہی تھی تمہارا باپ اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ زندہ رہ سکے اور مقدونیہ کی بادشاہی پر سانپ بن کر بیٹھا رہے۔“

شاہ فیلقوس کے مرنے کے بعد اُس کے جانشین کا فیصلہ کرنا تھا۔ جرنیل اور وزیر اکٹھے ہوئے۔ پہلا نام سکندر کا پیش ہوا۔ اطالوس نے کہا کہ چونکہ فیلقوس نے سکندر کی ماں کو طلاق دے دی تھی اس لیے سکندر وراثت کے حق سے محروم ہو چکا ہے۔ اُس نے یہ انکشاف کیا کہ دو ماہ بعد قتلویہ کے لپٹن سے فیلقوس کا بچہ پیدا ہوگا۔ اُس کے بالغ ہونے تک قتلویہ کے سر پر مقدونیہ کا تاج رکھ دیا جائے۔

قتلویہ بھی وہاں موجود تھی۔ اُس کے چہرے پر رونمائی تھی۔ اُسے فیلقوس کے مرنے کا کوئی غم نہیں تھا۔ اجلاس کے کئی ایک شرکار نے

اطالوس کی تجویز کی حمایت کی اور کہا کہ تخت کا جائز وارث وہ بچہ ہوگا جسے قتلویہ دو ماہ بعد جنم دینے والی ہے۔ اُس کی جوانی تک قتلویہ کو حکومت دے دی جائے۔

عین اُس وقت کمرے کا دروازہ بڑی زور سے کھلا۔ سب نے اُدھر دیکھا۔ دروازے میں سکندر کی ماں اولپیاں کھڑی تھی۔ حکومت کے کاروبار میں اس کا عمل دخل ختم ہو چکا تھا۔ اس کا شاہی خاندان کے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اب ایک عام عورت تھی۔ اُس کے سیاہ چمکیلے بال اُس کے شانوں پر کھیرے ہوئے تھے۔ وہ کندھوں سے ٹخنوں تک ایک سفید چادر میں لپیٹی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی تمام جرنیل اور وزیر عظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ اُس کے چہرے کے جلالی حسن کا اثر تھا ورنہ وہ اب عظیم کے حق سے محروم تھی۔ اُس نے قمر بھری نظروں سے قتلویہ اور اُس کے چچا اطالوس کو دیکھا۔

”میں تم سب کو خبردار کرنے آئی ہوں کہ میرے بیٹے کو تخت کی وراثت سے محروم کیا گیا تو میں ایک غضب ناک بدرود کی طرح تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم سب مجھے جانتے ہو۔ تم جانتے ہو میں کیا کر سکتی ہوں۔ تم سب کی جانیں میری منٹھی میں ہیں سوچو اور فیصلہ کرو۔“ وہ باہر نکل گئی۔ اُسی روز شاہی فرمان جاری ہوا کہ آج سے شاہ فیلقوس کا بیٹا سکندر مقدونیہ کا بادشاہ ہے۔

ماں نے بیٹے کو بادشاہ بنا دیا لیکن اُس نے بیٹے سے کہا۔ ”میرا کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ مجھے عظیم بننا ہے۔ ایشیا کا حکمران بننا ہے۔“

اُس وقت سکندر کی عمر بیس سال تھی۔ اُس نے سب سے پہلے ایران فتح کیا۔ اُس نے اس میں صرف پندرہ ماہ صرف کیے۔ اُس کی عمر ابھی بائیس سال نہیں ہوئی تھی کہ وہ ایشیا کی فتح کے لیے نکلا۔ اُس نے ایران فتح کیا پھر ہندوستان پر چڑھا۔ ایران اور ہندوستان کے درمیان بہت سی سلطنتیں تھیں جو اُس نے فتح کیں اور دنیا کی تاریخ بدل

## خنجر جہول میں اتر گیا

ڈالی۔ تاریخ میں ایسے بہت سے فاتح ملتے ہیں جنہوں نے سکندر سے زیادہ فتوحات حاصل کیں لیکن فرق یہ تھا کہ ہر حملہ آور نے بستیاں تباہ کیں، لوٹ مار کی، عورتوں کو ذلیل و خوار کیا اور ظلم و تشدد سے لوگوں کو جنگلوں میں بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے برعکس سکندر نے تباہی کی بجائے تعمیر کی۔ لوٹ مار نہیں کی۔ اُس نے تباہ حال بستیوں کو آباد کیا اور جنگلوں میں رہنے والوں کو شہروں میں آباد کیا۔ اُس نے نئے شہر تعمیر کیے۔

اُس پر اپنے استاد ارسطو کا بہت اثر تھا۔ ارسطو نے اُسے یہی سبق دیا تھا کہ ہر انسان ایک خدا کا بندہ ہے اور ہر کسی کو باعزت زندگی گزارنے کا پیدائشی حق حاصل ہے۔ سکندر نے اسی کو اپنا اصول بنایا۔ اُس نے اپنے آپ کو کوئی خطاب نہ دیا۔ اُسے مفتوحہ ملکوں کے لوگوں نے سکندر اعظم کہا۔

اُس کے اندر بخش تھا جسے ارسطو نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ وہ ہر لمحہ یہ جاننے کے لیے بے تاب رہتا تھا کہ پہاڑی کے دوسری طرف کیا ہے اور پہاڑی کو پھلانگ جاتا تھا۔

عمر نے وفات کی۔ مقدونیہ سے نکلنے کے صرف گیارہ سال بعد سکندر اعظم مر گیا۔ وہ ۳۵۶ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۳۲۳ قبل مسیح میں مر گیا۔ اُس نے کل ۳۳ سال عمر پائی۔ مرتے وقت اُس نے وصیت کی تھی کہ میرے دونوں ہاتھ تابوت سے باہر رکھنا تاکہ دیکھنے والے عبرت حاصل کریں کہ آدمی دنیا کا فاتح دنیا سے خالی ہاتھ جا رہا ہے۔



رنگیلا ایک بادشاہ تھا جس کا نام محمد شاہ تھا اور جو تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں مغلیہ خاندان کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ انگریزوں کی ایٹھ انڈیا کمپنی کے قدم جمتے جا رہے تھے۔ محمد شاہ رنگیلا دلی کا بادشاہ تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو اس احساس سے بے نیاز کر رکھا تھا کہ اُس کے خاندان کی سلطنت ریزہ ریزہ ہو چکی ہے اور اُس کی اپنی بادشاہی کے نیچے سے زمین نکل جا رہی ہے۔ وہ عیش و عشرت میں بدست تھا۔ اُس کی راتیں شراب کی مستی میں گزرتی تھیں اور صبح اُٹنے کے جاگنے کے وقت اُس کی خواب گاہ کے باہر چند ایک گانے والیاں دھیمے اور میٹھے سُروں میں کوئی راگ گنگنائی تھیں۔ اس ترنم سے رنگیلے بادشاہ کی آنکھ کھلتی تھی۔ ایک حسین کنیز جس کا نام گلبدن تھا رنگیلے بادشاہ کی خواب گاہ میں داخل ہوتی اور گلاب کے تازہ پھول سے اُس کے پاؤں کے تلوے سلاتی۔ محمد شاہ رنگیلا انگڑائی لے کر کروٹ بدلتا اور گلبدن کے عریاں کندھے پر ہاتھ رکھ کر اٹھتا اور سب سے پہلے میٹھی شراب کے چند گھونٹ پیتا تھا۔

یہ کہانی اس رنگیلے بادشاہ کی نہیں، ایک اور بادشاہ کی ہے جس کا نام نادر شاہ قلی خان تھا اور جو ایران سے ہندوستان آیا تھا اور یہ کہانی ایک بڑی ہی حسین اور باوقار عورت کی ہے جس کا نام ستارہ تھا اور جو محمد شاہ رنگیلا

نے نادر شاہ علی خان کو تحفے کے طور پر پیش کی تھی۔

بادشاہ رنگیلا ہوتا تو امراء، وزراء اور فوج کے حاکم بھی رنگین مزاج ہوجاتے ہیں۔ دربار میں رنگ ریلیاں منائی جاتی ہیں۔ خوشامدیوں کے دارے نیارے اور رعایا کا خداحافظ ہوتا ہے۔ گناہ عام ہوجاتے ہیں۔ اخلاق نہیں رہتا، قانون نہیں رہتا۔ محمد شاہ رنگیلے کے دور میں شراب خوری اور بدکاری عام ہو گئی تھی۔ حاکم اُسی کا کام کرتے تھے جو رشوت میں شراب اور عورت پیش کرتا تھا۔ کس سنگھ محمد شاہ رنگیلے کا ایک عہدیدار تھا۔ اُس نے دلی کے قریب کسل پورہ نام کی ایک بستی بسادی تھی جس میں اُس نے دُور دُور سے بڑی خوبصورت عورتیں لا کر آباد کیں اور وہاں پینے پلانے کا ایسا انتظام کیا جیسے شراب کی نہریں بہتی ہوں۔ دلی کے عیاش لوگ، شہزادے اور امیرزادے وہاں عیش و عشرت کے لیے جاتے تھے۔

انہی دنوں ۱۷۳۲ء میں ایران میں ایک گڈرے کا بیٹا جس کا نام نادر شاہ تھا، سراٹھا رہا تھا۔ نادر شاہ کو تاریخ ایک بہت بڑے جنگجو کی حیثیت سے یاد کرتی ہے۔ وہ ۱۶۸۷ء میں خراسان میں پیدا ہوا تھا۔ جوان ہوا تو اس میں کوئی اور ہی عزم اور جوش و جذبہ ابھر آیا۔ اُس کا باپ مرگیا تو اُس نے باپ کی بھیڑ بکریاں بیچ ڈالیں اور اپنے جیسے چند ایک نوجوانوں کا ایک گروہ بنالیا۔ اس گروہ نے قانون کو ٹوٹنا شروع کر دیا۔ اس کا سردار نادر شاہ تھا جو بہت بڑے خزانے کا مالک بن گیا۔ اُس نے اپنے گروہ کی نفری میں اضافہ کرنا شروع کر دیا اور تھوڑے سے عرصے میں اُس کا گروہ چھ ہزار دیر اور پرمعوم جوانوں کی فوج بن گیا۔

اُس وقت ایران کا بادشاہ شاہ تہما سپ دوم تھا۔ اُسے شاہِ افغانستان سے ہمیشہ خطرہ لگا رہتا تھا۔ نادر شاہ نے اُسے کہا کہ وہ اپنی فوج سے افغانستان کی فوج کو شکست دے سکتا ہے۔ شاہِ ایران نے اُسے اجازت دے دی۔ نادر شاہ بیٹا تو گڈرے کا تھا لیکن خدا نے اُسے عسکری فہم و فراست سے نوازا تھا۔ اُس نے اپنی چھ ہزار فوج سے جو دراصل رہزنی میں مہارت رکھتی

تھی، افغانستان پر حملہ کر کے شاہِ ایران کے اس ڈٹن کو ٹھنڈا بٹھا دیا اور اس سے اصفہان کا علاقہ چھین کر شاہِ ایران کی بادشاہی میں شامل کر دیا۔ اس کا میابی سے نادر شاہ کو ایک تو سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی دوسرے وہ شاہِ ایران کے فیصلوں پر غالب آگیا۔

کچھ عرصہ بعد شاہ تہما سپ نے ترکوں کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کر لیا جو نادر شاہ کو اچھا نہ لگا۔ نادر شاہ کی اپنی فوج تھی۔ اُس نے شاہ تہما سپ کا تختہ الٹ کر اُس کے بیٹے کو جس کی عمر مرث چھ مہینے تھی، شاہِ ایران بنا کر تخت پر بٹھا دیا۔ یہ واقعہ ۱۶ اگست ۱۷۳۲ء (۱۱۴۵ھ) کا ہے۔ ظاہر ہے نادر شاہ خود عملاً شاہِ ایران بن گیا۔ یہ سچہ اُسی سال مرگیا۔ امراء و وزراء نے نادر شاہ سے کہا کہ ایران کو دشمنوں سے بچانے کے لیے خود ایران کی بادشاہی سنبھال لے۔

نادر شاہ نے اپنی جنگی فہم و فراست کے بل بوتے پر ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر فوج کشی کی۔ وہ جن علاقوں سے گزرا انہیں تہ تیغ کرتا چلا آیا۔ اُس وقت دلی کے تخت پر محمد شاہ رنگیلا رنگ ریلیاں منا رہا تھا۔ وہ گرد و پیش کے خطرات اندرونی حالات اور حملہ آوروں سے بے نیاز تھا۔ نادر شاہ نے افغانستان کے دارالحکومت کابل کو محاصرے میں لے رکھا تھا۔ کابل کے حکمران اشرف نے محمد شاہ رنگیلے کو ایک تحریری پیغام بھیجا کہ وہ اُس کی مدد کر آئے اور اگر نادر شاہ نے کابل کو فتح کر لیا تو اس کا اگلا ہدف دلی ہوگا۔

جب قاصد دلی پہنچا، اُس وقت محمد شاہ رنگیلے نوشی میں مست اور مگن تھا۔ اُسے شاہِ کابل کا پیغام پڑھ کر مٹایا گیا۔ اُس نے پیغام اپنے ہاتھ میں لیا اور اُسے شراب کے پیالے میں ڈبو کر کہا۔ ”اُس بے معنی کاغذ کو شراب میں ڈوب جانا چاہئے۔“ اور خطرے کا اتنا بڑا اسکینل شراب کے نشے کی نذر ہو گیا۔

پھر یوں ہوا کہ نادر شاہ نے کابل فتح کر لیا اور اُس نے دلی کا رخ



اور احمد خان قندھاری کو اپنے خیمے میں بلایا۔

نادر شاہ نے ان سے بات شروع کی ہی تھی کہ دربان نے خیمے کا پردہ اٹھایا۔

”کیا ہے؟“ نادر شاہ نے غضبناک آواز میں کہا۔ ”کیا تم نے دیکھا نہیں کہ....“

”جان بخشی شاہ ایران و افغانستان!۔ دربان نے کہا۔ ”آپ کے غلام نے یہ گستاخی اس لیے کی ہے کہ مغل بادشاہ، محمد شاہ رنگیلا نے کچھ تحفے اور پیغام بھیجا ہے۔“

”تحفے کیا ہیں؟“

”ایک ہاتھی ہے۔“ دربان نے جواب دیا۔ ”چند اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور پچاس غلام ہیں اور بہت سی جوان عورتیں ہیں جو اس قدر حسین ہیں کہ انہیں انتظار میں ٹھہرا رکھنے کی جرأت نہیں کر سکا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہِ دلی نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔“ نادر شاہ نے کہا۔ ”وہ عقل والا معلوم ہوتا ہے۔ ہم جانتے تھے کہ ایسے بادشاہ کی فوج بھی ایسی ہوگی اور وہ لڑنے کی جرأت نہیں کرے گی۔“

”شہنشاہ ایران!۔ احمد خان قندھاری نے کہا۔ ”اس قسم کے بادشاہ جیسا کہ دلی کا بادشاہ محمد شاہ ہے، اپنی نجات کا ذریعہ اسی کو سمجھتے ہیں کہ دشمن کو دوست کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں اور اپنی رعایا کو بھی یہی یقین دلاتے رہتے ہیں کہ جسے وہ اپنا دشمن سمجھتے ہیں وہ دراصل ان کا دوست ہے۔“

”اُس نے حسین عورتیں بھیج کر ہمیں بھی فریب دینے کی کوشش کی ہے۔“ نادر شاہ نے کہا۔ ”کیا ہمیں یہ عورتیں قبول کر لینی چاہئیں؟“

”یہ فیصلہ شہنشاہ خود کریں تو بہتر ہوگا۔“ علی اکبر وزیر نے کہا۔ ”میں آپ کو یہ بتا سکتا ہوں کہ ایران کا حسن دنیا کے گوشے گوشے میں مشہور

کیا۔ محمد شاہ رنگیلا کو اُس کی پیشقدمی کی اطلاع ملتی رہی اور وہ رنگین راتوں میں جھومتا رہا، بدست رہا، حتیٰ کہ اُسے نادر شاہ کا پیغام ملا کہ وہ دلی کا تخت و تاج اُس کے حوالے کر دے اور قتل و غارت تک نسبت نہ آنے دے۔ محمد شاہ رنگیلا نے کوئی جواب نہ دیا اور اُس کے وزیر ارادہ فوج کے اعلیٰ حکام اُسے یہی تاثر دیتے رہے کہ کوئی خطرہ نہیں، نادر شاہ ابھی بہت دور ہے۔ رنگیلا بدست رہا اور جان نہ سکا کہ اُس کے وزیر ارادہ سالار جنگ سے بچنا چاہتے ہیں۔

نادر شاہ کو جاسوسوں نے بتایا تھا کہ دلی ایک خزانہ ہے جہاں دُنیا کا ایک عجوبہ تختِ طاووس بھی ہے جس میں بیش قیمت ہیرے جڑے ہوئے ہیں اور وہاں زرد دولت کے انبار ہیں اور وہاں کا بادشاہ رنگین مزاج ہے، لڑنے کے قابل نہیں اور وہاں کے حاکم بھی عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ نادر شاہ نے لڑے بغیر دلی پر قبضہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اُس نے محمد شاہ رنگیلا کو دو تین خط لکھے اور آخری خط میں دھمکی دی کہ اب وہ اپنے خطوط کا جواب لینے خود آئے گا۔ تب وزیر ارادہ نے اپنے رنگیلے بادشاہ سے کہا کہ وہ نادر شاہ کو جواب دے دے۔

”ہم جواب دینا چاہتے ہیں۔“ محمد شاہ رنگیلا نے کہا۔ ”مگر ہم سمجھ نہیں سکتے کہ نادر شاہ کو کس القاب سے مخاطب کیا جائے۔ وہ خاندانی بادشاہ نہیں۔ وہ ایک گڈ رستے کا بیٹا ہے اور وہ رہزن اور ڈاکو ہے۔“

دربار میں یہی بحث چل پڑی کہ نادر شاہ کو کس القاب سے خطاب کیا جائے۔ ہر دباری اور حاکم محمد شاہ رنگیلا کی ماں میں ماں ملانے کی کوشش کر رہا تھا اور رنگیلا خود کسی فیصلے پر پہنچنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ اس بحث میں اتنے دن گزر گئے کہ نادر شاہ اپنی فوج کے ساتھ کرنال میں آغیہ زن ہوا۔ یہاں سے اُسے دلی پر حملہ کرنا تھا۔ پیشقدمی کا دن اور وقت مقرر کرنے کے لیے نادر شاہ نے اپنے دو وزیروں علی اکبر

ہے لیکن ہندوستان کے نسوانی حسن میں وہ جادو ہے جس سے ایران کی عورت محروم ہے۔ یہاں کی عورت کا قد سرور کی مانند ہوتا ہے اور اس کی رعنائی گلوں کو شرباتی ہے۔ یہاں کی عورت آہو چم ہوتی ہے اور اس میں ہرن کی چھرتی پائی جاتی ہے۔۔۔ اور جو عورت سٹھے میں آتی ہے اُسے دیکھ کر تیرگیوں سے نکل کر ترشش میں اور تلواریں نیاموں میں واپس چلی جاتی ہیں۔“

دوسرے وزیر احمد خان قندھاری نے بھی ہندی کینزوں کا تصور دیکھ کر ایسا پیش کیا کہ نادر شاہ اٹھا اور خیمے سے نکل گیا۔ اُس نے حکم دیا کہ ہاتھی اور گھوڑے اسٹبل کے حوالے کر دیئے جائیں اور غلام غلاموں کے احاطے میں چلے جائیں۔ وہ خود ان عورتوں کے قریب چلا گیا جو محمد شاہ رنگیلا نے بھیجی تھیں۔ وہ عورتیں نہیں جوان لڑکیاں تھیں۔ اُس نے ہر ایک کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور اُس کی نگاہیں گھومتی پھرتی ایک لڑکی پر جم گئیں۔ وہ دراز قد تھی اور اُس میں کوئی ایسا طلسم تھا جس نے نادر شاہ کو مسحور کر لیا۔ نادر شاہ نے اُسے نظر بھر کر دیکھا تو لڑکی نے نظریں نیچی کر لیں۔

”یہ لڑکی کون ہے؟“ نادر شاہ نے کہا۔ ”کیا ایسے ہیرے تجھے میں دیتے جاتے ہیں؟“

”یہ ایک راجپوت دوشیزہ ہے۔“ لڑکیوں کے ساتھ آئے ہوئے ایک آدمی نے جواب دیا۔

”یہ جھوٹ بکتا ہے۔“ لڑکی نے نڈر ہو کر کہا۔ ”میں دوشیزہ (کنواری) نہیں۔ میرا خاوند ہے۔ مجھے خاوند سے چھین کر زبردستی بھیجا گیا ہے۔“

ایسی عورتوں کو کینز کہتا تھا۔ ان کی حیثیت بھید بکریوں جیسی ہوتی تھی۔ انہیں بولنے اور فریاد کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی مگر اس کینز نے بڑی بے باکی سے بات کی تھی۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے دلی کے آدمی نے چڑے کا ہنٹر سیدھا کیا کہ ایسی گستاخ اور بے ادب کینز کو زبان درازی کی سزا دے۔ کینز نے اپنے پٹوں کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک خنجر نکال کر بولی۔ ”آگے آؤ اور مجھے ضرب لگا کر دکھیو۔“

سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ نادر شاہ سے یہ توقع نہیں کھی جاسکتی تھی کہ وہ ایسی بدتمیز کینز کو بخش دے گا۔ سب منتظر تھے کہ نادر شاہ حکم دے گا کہ اس لڑکی کو وحشی غلاموں کے حوالے کر دو، مگر سب دیکھ کر حیران رہ گئے کہ نادر شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں کوئی اور ہی چمک تھی۔ اُس نے جب دلی کے اس آدمی کو دیکھا جس نے ہنٹر سے اس کینز کو مارنا چاہا تھا تو نادر شاہ کی آنکھوں میں اور اُس کے چہرے پر قہر اُتر آیا۔ وہ آگے بڑھا۔

”لڑکی! نادر شاہ نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔“ خنجر ہمیں دے دو۔“  
”دو خنجر راجپوت کی بیٹی کا زیور ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”جان دے دوں گی خنجر نہیں دوں گی۔“

”لڑکی! نادر شاہ نے غصے سے نہیں شاہی جلال سے کہا۔“ تمہاری قدر ہم جانتے ہیں، محمد شاہ کیا جانے۔۔۔۔۔ خنجر ہمیں دے دو۔“  
جانے کیا بات تھی کہ لڑکی آگے بڑھی اور خنجر نادر شاہ کو دے دیا۔ نادر شاہ نے کہا۔ ”ہم ان نازک ہاتھوں کے قدر دان ہیں جو خنجر کو اتنی مضبوطی سے پکڑ سکتے ہیں۔“

لڑکی نادر شاہ کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت نادر شاہ پر بھی طاری تھی۔ نادر شاہ خیمے میں چلا گیا۔ اس کا ذاتی خادم اور محافظ ایک بلند قامت اور گٹھے ہوئے جسم والا حبشی آغا باشی تھا۔ نادر شاہ نے اُسے اندر بلا کر کہا۔ ”اس لڑکی کو اندر بھیج دو اور باقی لڑکیوں کو حرم میں داخل کر دو۔“

آغا باشی باہر نکل گیا اور چند لمحوں بعد وہ کینز خیمے میں داخل ہوئی۔ خیمے میں مدھم سی روشنی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ قندیل کی اس ہلکی روشنی میں کینز اور زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی اور نادر شاہ اُسے دیکھ رہا تھا۔

”اب میں تمہارے چہرے پر خوف دیکھ رہا ہوں۔“ نادر شاہ نے کہا۔ ”کیوں؟ یہ خوف کیسا؟“

”کیونکہ میرے ہاتھ میں خنجر نہیں“۔ لڑکی نے کہا۔ ”سنا تھا کہ شہنا ایران بہت بڑا جنگجو اور طاقت ور ہے مگر میرے ملک میں اگر اُس نے سب سے ایک عورت سے ہتھیار ڈلوائے ہیں۔ کیا کوئی طاقتور بادشاہ اس پر خنجر کر سکتا ”زندہ باد!“۔ نادر شاہ نے بے ساختہ کہا۔ ”ہم اُس عورت کی تما میں تھے جو اپنی عصمت کو ہتھیار نہ سمجھے۔ عورت مرد کو اپنے حسن اور رانی عہ سے زیر کیا کرتی ہے مگر تم نے ہمیں اپنی غیرت اور محبت سے زیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم تمہیں اپنی شہنشاہیت کے رعب سے زیر نہیں کریں گے۔ یہ نام کیا ہے؟“

”ستارہ!“۔ لڑکی نے جواب دیا۔ ”میرا نام ستارہ ہے۔“

”تم اپنی قسمت کا چمکتا ہوا ستارہ ہو۔“ نادر شاہ نے کہا۔ ”تم کہا تھا کہ تمہارا خاوند بھی ہے؟“

”میں راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔“ ستارہ نے کہا۔

”ابھی دس گیارہ سال کی تھی کہ میری خوبصورتی میری بڑیبی کا باعث بن گئی۔ مجھے مغلوں نے اغوا کر لیا اور میری شادی ایک مغل فوجی کے ساتھ کر دی گئی۔ میں وہاں سے بھاگ گئی مگر اپنے گھرنے گئی تاکہ پھر نہ پڑی جاؤں۔ میں ایسی بھاگی جا رہی تھی کہ تاجروں کے ایک قافلہ سالار نے مجھے روک لیا اور پوچھا کہ میں کون ہوں۔ میں نے بتایا تو اُس نے شفقت سے مجھے پناہ میں لے لیا۔ قافلہ دلی جا رہا تھا۔ وہاں لے جا کر اس تاجر نے مجھے شہنشاہ کے حرم میں دے دیا۔ میں قید ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں اُس نے مجھے کس قیمت پر بیچا تھا۔ وہاں میں کنیز بن گئی اور اب آپ کو بطور تحفہ دے دی گئی ہوں۔“

”اب تم کنیز نہیں ہو۔“ نادر شاہ نے بے ساختہ کہا۔ ”اب اپنے آپ کو ملکہ سمجھو۔“

”میں آپ کے قبضے میں ہوں۔“ ستارہ نے کہا۔ ”مجھے فریب دینے کی آپ کو کیا ضرورت محسوس ہوئی ہے؟ مرد عورت کو یہی کہہ کر دھوکہ دیا کرتا ہے کہ تمہیں ملکہ بناؤں گا۔“

”ستارہ!“۔ نادر شاہ نے کہا۔ ”ہم تم سے پوچھ رہے ہیں کہ ملکہ بنو گی؟“

”نہیں۔“ ستارہ نے کہا۔ ”آپ کا قبضہ میرے جسم پر ہے میرے دل پر نہیں۔ میرا جسم آپ کو شہنشاہ تسلیم کرتا ہے، دل نہیں، کیونکہ آپ پر شاید میرے حسن کا سرور طاری ہے اور آپ سفلی جذبات سے مغلوب ہو کر مجھے ملکہ کہہ رہے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میں چند راتوں کی ملکہ ہوں گی۔“

”ستارہ!“۔ نادر شاہ نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں

کے پیالے میں لے کر کہا۔ ”ہمیں دل سے قبول کر دو گی تو تمہارا جسم اس خیمے میں داخل ہو سکے گا۔ یہ ہماری درخواست ہے۔“

درخواست ہے۔ ستارہ کا نپ گئی۔ ایران کا جنگجو اور جابر شہنشاہ جو ملکوں، قلعوں اور فوجوں کو روندنا آیا تھا، ایک کنیز سے درخواست کر رہا ہے کہ مجھے دل سے قبول کر لو اور ملک بن جاؤ۔ اُس نے نادر شاہ کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ یہ ایک جابر اور جنگجو بادشاہ کا چہرہ تھا لیکن اس کی آنکھوں میں وہ مرد جھانک رہا تھا جس کے ہاں حسین عورتوں کی تو کوئی کمی نہیں تھی، محبت کی کمی تھی۔ ایک انتظار تھا۔ اُس عورت کا انتظار جو اُسے دل سے قبول کرے۔ ستارہ کے وجود میں اُسے وہ عورت نظر آگئی تھی جو ہاتھ میں خنجر لے کر اُس کے پاس آئی تھی۔

ستارہ پر نادر شاہ کی اس کیفیت کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ بے ساختہ نادر شاہ کے قدموں میں گر پڑی۔ نادر شاہ نے اُسے پیار سے اٹھایا۔

”اب تم نہیں، اب لوگ تمہارے قدموں میں گر آکر یں گے۔“

نادر شاہ نے کہا۔ ”اب تم کنیز نہیں ملکہ ہو۔“

نادر شاہ نے آغا باشی کو بلا کر حکم دیا کہ اس لڑکی کو لے جاؤ۔ احترام سے رکھو اور قاضی کو بلا لاؤ۔ تھوڑی دیر بعد قاضی آگیا جس نے نادر شاہ اور ستارہ کی شادی کر دی۔ ستارہ کا خیمہ الگ کر دیا گیا۔ نادر شاہ کے خیمے میں وہ کنیز کی حیثیت سے داخل ہوئی تھی اور ملکہ ایران بن کر نکلی۔ اُس روز کے بعد

نادر شاہ ستارہ کے خیمے میں جاتا تھا تو وہ شاہ ایران نہیں بلکہ بیوی سے دلی محبت کرنے والا شوہر ہوتا تھا۔

پورا حرم نادر شاہ کے ساتھ تھا۔ اس میں ایران، خراسان اور افغانستان کی دو چار ایسی حسین اور چالاک عورتیں بھی تھیں جو نادر شاہ کی منظور نظر تھیں۔ ان میں ایک کا نام شیرازی تھا۔ بہت خوبصورت اور دلربا بھی۔ اسے نادر شاہ کی چہیتی کہا جاتا تھا۔ ستارہ آئی تو شیرازی کو گرسن لگ گیا۔ اب نادر شاہ حرم کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ حرم کی عورتوں نے ستارہ کی خوشامد اور مٹھی چابی شروع کر دی کیونکہ وہ اب ان کی ملکہ تھی۔ شیرازی نے بھی یہی روئے اختیار کیا۔ وہ بہت ہی چالاک عورت تھی۔ اُس نے زبان کے جادو سے ستارہ کو اپنی ہم زبانی بنالیا مگر شیرازی ستارہ اور نادر شاہ میں غلط فہمی پیدا کر کے ستارہ کو اس رُتے سے گرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔

نادر شاہ کو دلی پر قبضہ کرنا تھا۔ اُس کی فوج خیر گاہ میں بیکار پڑی تھی۔ یہ کیفیت فوج کے لیے اچھی نہیں ہوتی۔ نادر شاہ نے دلی کی طرف کوچ کا فیصلہ کیا اور رات کو ایک بیش قیمت ہیرا ستارہ کو دے کر کہا: ”تم میرے ساتھ رہو گی لیکن دوسرے ملک پر جب فوج کشی کی جاتی ہے تو کچھ دنوں کے لیے جدائی ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں اگر تمہیں میری ضرورت پڑے تو یہ ہیرا قاصد کے ہاتھ بھیج دینا۔ میں آ جاؤں گا۔ اس ہیرے کے بغیر میں تمہارے پیغام پر اعتبار نہیں کروں گا کیونکہ تمہارے پیغام کے دھوکے میں مجھے دشمن گھات میں لاکر قتل کر سکتا ہے۔“

دوسرے دن نادر شاہ نے دلی کی طرف کوچ کیا۔ توقع تھی کہ بہت لڑائی ہوگی۔ دلی کا محاصرہ معلوم نہیں کتنے عرصے بعد کامیاب ہو شاید ناکام ہی لوٹنا پڑے مگر جاسوس بتا رہے تھے کہ دلی میں امن و امان ہے۔ بادشاہ پہلے کی طرح امراء و وزراء اور سالاروں کے ساتھ رنگین زندگی گزار رہا ہے۔ کوئی جنگی تیاری نہیں۔ یہ دھوکہ بھی ہو سکتا تھا۔ نادر شاہ چونکنا ہو گیا۔ اُسے خدشہ تھا کہ راستے میں اُس کی فوج کے پڑاؤ پر حملہ ہو گا مگر کچھ بھی

نہ ہوا۔

دلی میں یہ کیفیت تھی کہ محمد شاہ رنگیلا کو نادر شاہ کے کوچ کی اطلاع مل رہی تھیں اور اُس نے حکم دے دیا تھا کہ نادر شاہ آئے تو اس کا استقبال دوست کی حیثیت سے کیا جائے اور شہر کے دروازے کھول دیے جائیں۔ اُس کے سالار اپنی فوج سمیت اس قدر آرام طلب اور رنگین مزاج ہو گئے تھے کہ انہوں نے محمد شاہ رنگیلا کے اس حکم کی بہت تعریف کی۔

آخر نادر شاہ دلی کے دروازوں تک پہنچ گیا۔ وہاں اُس کا شانہ استقبال کیا گیا۔ ستارہ جو دلی سے کینز بن کر نکلی تھی، ملکہ بن کر داخل ہوئی اور محمد شاہ رنگیلا کی ملکہ نے آگے بڑھ کر اُس کا استقبال کیا۔ تھوڑا ہی عرصہ پہلے ستارہ اس ملکہ کی کینز تھی۔ محمد شاہ رنگیلا کی ملکہ نے ستارہ سے التجا کی کہ وہ شہنشاہ ایران سے کہے کہ دلی میں لوٹ مار اور قتل و غارت نہ ہوا۔ شہنشاہ محل میں ایک دوست کی حیثیت سے داخل ہو۔

”اس کا انحصار آپ کے رویے پر ہے۔“ ستارہ نے کہا۔ ”اگر آپ کی طرف سے مزاحمت نہیں ہوگی تو قتل و غارت کیوں ہوگی میں شہنشاہ ایران نادر شاہ سے کہہ دوں گی کہ وہ دلی پر ہاتھ نہ اٹھائے۔“

ستارہ کے کہنے پر نادر شاہ نے حکم دے دیا کہ دلی کے لوگوں کا احترام کیا جائے۔

محمد شاہ رنگیلا نے نادر شاہ کا استقبال کیا۔ ایران کی فوج کو توقع تھی کہ دلی کی لوٹ مار انہیں مالا مال کر دے گی۔ انہوں نے سُن رکھا تھا کہ میاں کے لوگ بہت مالدار ہیں مگر لوٹ مار ممنوع قرار دے دی گئی۔ اس حکم سے فوج میں چرمیوٹیاں ہونے لگیں۔ سالاروں تک نے ناک بھون چڑھائی۔ شیرازی کو موقع مل گیا۔ اُس نے سالاروں میں مستہور کر دیا کہ نادر شاہ نے یہ علم ستارہ کے کہنے پر جاری کیا ہے اور وہ میاں کا خزانہ سمیٹنا چاہتی ہے۔ اُس زمانے میں مال غنیمت میں سے فوج کے ہر فرد کو حصہ ملا کرتا تھا۔ یہ سب سے بڑی کشش تھی لوگوں کو فوج میں لے جاتی تھی۔ شیرازی نے ستارہ



کے خلاف خاصی نفرت پیدا کر دی۔ بعض فوجی حکام نادر شاہ کو بھی ناپسند کرنے لگے کہ اس کے احکام ایک عورت کے پابند ہو گئے ہیں۔ ستارہ نے اپنی طرف سے بھی اعلان کر دیا کہ کوئی ایرانی سپاہی کسی ہندوستانی سپاہی یا شہری کے ساتھ بدتمیزی سے پیش نہیں آئے گا مگر ہوا یوں کہ لوگ عید قربان منا رہے تھے کہ دن کے پچھلے پہر دلی میں ایرانی فوج کے چند ایک سپاہی جو شہر کی کسی نہ کسی گلی میں آگے دتے گھوم پھر رہے تھے ہندوستانی سپاہیوں نے قتل کر دیئے۔ اُس وقت دلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز فوجی بھی تھے جو محمد شاہ زنگیلا نے کرائے پر لے رکھے تھے۔ ایک ہی رات میں ایرانی سپاہیوں کے علاوہ سات سو انگریز بھی ہندوستانیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ رات بھر قتل عام جاری رہا۔ نادر شاہ کو اطلاع ملی تو حیران ہوا کہ یہ کس کے حکم سے ہو رہا ہے۔ اس کی ملکہ ستارہ اپنی جگہ پریشان تھی۔

صبح کو نادر شاہ گھوڑے پر سوار دلی شہر میں اس خیال سے نکلا کہ اُسے دیکھ کر ہندوستانی سپاہی ہاتھ روک لیں گے مگر نادر شاہ پر تعجب برساتے گئے بعض تو رخ کہتے ہیں کہ اُس پر بند قتل بھی چلائی گئیں اور ایک محافظ زخمی ہو گیا۔ نادر شاہ کو کبھی جگہوں پر ایرانی سپاہیوں کی لاشیں پڑی نظر آئیں۔ نادر شاہ نے غصے میں آکر حکم دیا۔ ”جہاں کسی ایرانی سپاہی کی لاش پڑی ہو وہاں کے ارد گرد کے علاقے میں دلی کا ایک بھی باشندہ زندہ نہ رہے۔“

ایرانی فوج ایسے ہی حکم کی منتظر تھی۔ حکم ملتے ہی دلی پر ٹوٹ پڑی اور ایسا قتل عام کیا جو دلی کی تاریخ نے اُس وقت تک نہیں دیکھا تھا۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ فوج اور شہریوں کو ملا کر دو لاکھ انسان قتل کر دیئے گئے۔ ستارہ کو جب پتہ چلا کہ ایرانیوں نے دلی والوں کا قتل عام شروع کر دیا ہے تو اُس نے نادر شاہ کو پیغام بھیجا پھر بھی قتل عام جاری رہا۔ ستارہ نے وہ ہیرا جو نادر شاہ نے اُسے دیا تھا، نادر شاہ کو بھیجا پھر بھی قتل عام جاری رہا۔ آخر ایک مغل شہزادے آصف جاہ کی منت سماجت پر قتل عام بند ہوا۔

بعد میں پتہ چلا کہ ایرانیوں کا قتل عام نادر شاہ کی سابقہ منظور نظر شہزادی

نے ایک افواہ اڑا کر شروع کرایا تھا۔ اُس نے ہندوستان کے مغل فوجیوں میں کسی دسالت سے یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ رات چند ایک ایرانی سپاہیوں نے چند ایک مغل فوجیوں کو قتل کر دیا ہے۔ اس افواہ کے ساتھ ہی شیرازی کے کرائے کے افواہ بازوں نے مغل سپاہیوں میں ایسا اشتعال پھیلا دیا کہ انہوں نے جہاں کہیں اکیلا ایرانی سپاہی دیکھا اُسے قتل کر ڈالا۔ ایک عورت کے

جذبہ رقابت نے ساری دلی کو خون میں ڈوب دیا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ ستارہ نے نادر شاہ سے یہ جو حکم دلایا تھا کہ دلی پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے وہ بیکار ہو جائے۔ صورت حال یہ تھی کہ نادر شاہ دلی کے قریب ایک محل مانجیسے میں رہتا تھا اور محمد شاہ زنگیلا دلی میں اپنے محل میں رہتا اور بدستور عیش و عشرت میں لگن تھا۔ عملاً حکومت نادر شاہ کی تھی۔ دونوں بادشاہ مل بیٹھتے اور گپ شپ ہوتی تھی۔ ان کی محفلوں کے دو واقعات دلچسپ ہیں۔ ایک یہ کہ نادر شاہ کو قبض کی شکایت ہو گئی۔ محمد شاہ زنگیلا نے اس کے لیے گلقدہ منگوائی جو ایک بڑے خوبصورت مرتبان میں تھی۔ شہری میں چاندی کا ایک خوبصورت چمچ تھا۔ گلقدہ صرف دو چمچ کھاتی تھی۔ نادر شاہ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ دو آئی ہے جس کی مقدار کی ایک حد ہوتی ہے۔ اُس نے گلقدہ ایک چمچ کھاتی اور بولا۔ ”طلوہ بہت لذیذ ہے۔“ اور آدھا مرتبان کھا گیا۔ محمد شاہ زنگیلا کے دربار کی ایک مغنیہ زور بانی تھی۔ ایک رات نادر شاہ نے اُس کا گانا سنا جو اُسے اتنا اچھا لگا کہ اُس نے زور بانی کو انعام دیا اور بولا۔ ”زور بانی! مروتے ہندو سپاہی کمن۔“ بیکہ براہ راست برہمن۔ (زور بانی! ہندوستان کے چہرے پر سیاہی بھیرے آئیں تجھے ایران نے چلے)۔ زور بانی حاضر جواب تھی۔ وہ نادر شاہ کے ساتھ ایران جانے سے انکار کرنا چاہتی تھی مگر نادر شاہ کے عتاب سے ڈرتی تھی۔ اُس نے کہا کہ وہ اس پیش کش کے جواب میں ایک غزل سنانا چاہتی ہے۔ چنانچہ اُس نے ایک غزل گائی:

من شمع جاگدازم تو صبح دلکشانی

سوزم گرت نہ نیم، میرم چورخ نمائی  
نزدیکت ایں چنینیم، دور آسپنا کہ انقتم

نئے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

(میں اپنی جان کو گھیلنے والی شمع ہوں اور تو دلکش صبح ہے۔  
جب تک میں تجھے نہ دیکھ لوں، جلتی رہتی ہوں لیکن جوں ہی تو اپنی موت  
دکھاتا ہے میں مرجاتی ہوں۔ تیرے نزدیک رہ کر میرا یہ حال ہے اور  
دور رہ کر وہ حال ہے جو میں نے ابھی بتایا ہے اس لیے مجھ میں نہ تیرے  
وصل کی تاب ہے نہ جدائی کی طاقت ہے۔)

نادرشاہ مسکرایا۔ وہ نوربانی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

نادرشاہ نے اپنے ایک بیٹے کی شادی دہلی کی ایک شہزادی  
سے کی اور محمد شاہ رنگیلا سے بے شمار زر و جواہرات لے لیے یہاں  
تک کہ تخت طاؤس بھی اٹھالیا جو آج تک شاہ ایران کے محل میں پڑا  
ہے۔ محمد شاہ رنگیلا نادرشاہ کو دوست بنائے رکھنا چاہتا تھا اس لیے  
اُس نے اپنے تخت و تاج کے تحفظ کی خاطر نادرشاہ کی ہر فرمائش پوری کی۔  
اس طرح نادرشاہ نے دہلی کا خزانہ خالی کر دیا اور اربوں روپے کی مالیت  
کے زر و جواہرات، ہیرے اور نقد سمیٹ کر شمالی ہندوستان کی طرف  
چل پڑا۔

بڑا لباس فرط کر کے وہ اپنی فوج کے ساتھ ایک دریا کے کنارے پہنچا  
اور فوج کو پٹاؤ کرنے کا حکم دیا۔ وہ ایک اجنبی دیس کو جا رہا تھا۔ اُس نے  
اس علاقے کے قبائلی سرداروں کو بلا کر اُن سے اطاعت قبول کرائی اور ان  
سے گائیڈ لیے۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ بڑی گرمی نیند سو گیا لیکن ستارہ  
کو نیند نہ آئی۔ اُس کے دل پر ایک خوف طاری رہنے لگا تھا۔ اُسے پتہ چل  
چکا تھا کہ شیرازی جو اُس کی رقیب ہے، انتقام کی آگ میں جل رہی ہے  
اور کسی بھی وقت وہ کوئی اوجھا دار کر سکتی ہے۔ ستارہ کے کان میں یہ جھنک

بھی پڑی تھی کہ شیرازی نے دو تین امراء و وزراء کو نادرشاہ کے خلاف کر دیا  
ہے اور نادرشاہ کی زندگی خطرے میں ہے۔ اُس نے نادرشاہ کو خبردار کیا  
تھا مگر نادرشاہ کو فتوحات اور دہلی کے خزانے نے منہ بھر اور مغرور بنا دیا تھا۔  
”کیا کوئی ایسی جرأت کر سکتا ہے کہ ایران کے شہنشاہ کی طرف آنکھ  
اٹھا کر بھی دیکھے؟“ نادرشاہ نے ستارہ سے کہا تھا۔ ”تم سے جلنے  
والے جلنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔“

ستارہ کی تسخنی نہیں ہوئی۔ اُس کی ایک حس اُسے خبردار کر رہی تھی  
کچھ کچھ ہونے والا ہے۔ اُس رات نادرشاہ گرمی نیند سو گیا مگر ستارہ نہ سو  
سکی۔ اُسے خیے سے باہر دہلی دہلی سی آوازیں سنائی دیں۔ وہ اٹھی اور بے  
پاؤں خیے کا جا پردہ اٹھایا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی پیٹ کے بل  
رینگتا خیے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ وہ خیے کے نیچے سے اندر آ جا رہا  
تھا۔ ستارہ خیے میں گئی۔ تلوار اٹھائی اور نادرشاہ کو جگا دیا۔ دونوں باہر نکلے  
تو انہیں دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں جو رات کی تاریکی میں غائب  
ہو گئیں۔ نادرشاہ نے اپنے محافظوں کو پکارا مگر اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ آگے  
جا کر دیکھا۔ اُس کے محافظ مرے پڑے تھے۔ انہیں ایسے طریقے سے  
قتل کیا گیا تھا کہ اُن کی آواز بھی نہ نکل سکی تھی۔

نادرشاہ نے اپنے سالاروں کے لیے قیامت بپا کر دی مگر قاتلوں  
کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ستارہ نے شیرازی پر شک کا اظہار کیا لیکن شیرازی نے  
ایسے انداز سے اور ایسے الفاظ میں اپنی بے گناہی کا اظہار کیا کہ نادرشاہ  
نے اُسے بے گناہ سمجھ لیا مگر حقیقت میں یہ قاتلانہ حملہ شیرازی نے  
ہی کرایا تھا۔

کچھ عرصے بعد نادرشاہ ہرات پہنچا۔ اُسے اطلاع ملی کہ اُس کا بیٹا  
جو دلی عہد ہے اُس کے استقبال کے لیے آ رہا ہے۔ باپ بیٹے کو جدا  
ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ دو روز بعد بیٹا باپ سے ملا۔ نادرشاہ  
بہت خوش تھا۔ ستارہ بھی خوش تھی مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی شیرازی

نادر شاہ سے تنہائی میں ملی۔

”آپ نے مجھ پر قاتلانہ حملے کا شک کیا تھا۔“ شیرازی نے اُسے کہا۔ ”میں اُس روز سے چین کی نیند نہیں سوتی۔ آپ میری پہلی اور آخری محبت ہیں۔ آپ مجھے دھتکار دیں مگر اپنی محبت کے ماتھوں مجبور ہوں۔ میں اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ آپ کو ہر خطرے سے بچاؤں اور آپ کے دل سے اپنے خلاف تمام شکوک دھو ڈالوں.... آج آپ نے اپنی موت کو گلے لگایا ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو تم؟“ نادر شاہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کون ہے جو میری موت کا پیغام لایا ہے؟“

”آپ کا اپنا بیٹا!“ شیرازی نے کہا۔ ”جو میں جانتی ہوں وہ آپ نہیں جانتے۔ میں نے آپ کے ولی عہد کو ستارہ کے خیمے میں دیکھا ہے اور میں نے جو دیکھا ہے اس پر آپ یقین نہیں کریں گے۔ آپ کا ولی عہد آپ کی وفات کا انتظار نہیں کرنا چاہتا۔ کیا آپ نے سوچا کہ وہ اتنی فوج لے کر یہاں کیوں آگیا ہے؟.... آپ کو قتل کرنے۔ میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ مجھے شک ہے کہ ستارہ نے اُس کے ساتھ ساز باز کی ہے۔ اُس نے آپ کے نوجوان فرزند پر اپنا جادو چلا لیا ہے۔ آپ یہ نہ بھولیں کہ ستارہ خاندانی ملکہ نہیں۔ وہ ایک سپاہی کی بیوی تھی پھر وہ حرم کی ایک ادنیٰ کنیز بنی۔ اس سے آپ اچھے کردار کی توقع نہیں رکھ سکتے۔“

نادر شاہ کا دماغ پہلے ہی خراب ہو چکا تھا۔ وہ اب اپنے آپ کو سکندر اعظم اور جنگیر خان سمجھنے لگا تھا۔ اُس میں اپنے خون کے رشتوں کی پہچان ختم ہو چکی تھی۔ شیرازی کا جادو چل گیا۔ نادر شاہ نے علم دیا کہ ولی عہد کی آنکھیں نکال دی جائیں۔ تخت طاؤس ہمارا منظر ہے۔

”شہنشاہ!“ ستارہ نے گھبرا کر کہا۔ ”یہ آپ نے کیا حکم دیا ہے۔ کیا باپ اپنے بیٹے کی آنکھیں نکال سکتا ہے؟“

”کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے اور تم اُس کی

طرفدار کی کیوں کر رہی ہو؟“

ستارہ نادر شاہ کو قاتل نہ کر سکی۔ منت سماجت کرتی رہی۔ آخر نادر شاہ تنگ آ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ستارہ کو پتہ چلا کہ نادر شاہ شیرازی کے خیمے میں چلا گیا ہے۔ وہاں سے وہ اپنے خیمے میں چلا گیا اور ستارہ اپنے خیمے میں آنسو بہاتی رہی۔ شیرازی ولی عہد سے جا ملی اور اُسے بتایا کہ اس کے باپ نے اُسے اندھا کر دینے کا حکم دے دیا ہے اور اُسے صرف ستارہ بچا سکتی ہے۔

ولی عہد اُسی وقت ستارہ کے خیمے میں چلا گیا۔ ادھر شیرازی نے نادر شاہ کو بتا دیا کہ ولی عہد رات کے اس وقت ستارہ کے خیمے میں ہے۔ نادر شاہ کچھ بھی نہ بولا۔ دوسرے دن ستارہ نے نادر شاہ سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو اندھا کرنے کا حکم واپس لے لے۔

”تھکاتم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہیں بھی اندھا کر دوں؟“ نادر شاہ نے غضب ناک آواز میں کہا۔

”نہن نادر شاہ!“ ستارہ نے نادر شاہ کی آواز سے زیادہ غضب ناک آواز میں کہا۔ ”مجھے تخت طاؤس نے اندھا کر دیا ہے۔ دلی کے زرد جواہرات نے تیری عقل پر ایسا پردہ ڈالا ہے کہ تجھ میں رحم اور عنوت کا امتیاز ختم ہو چکا ہے۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ جس خدا نے مجھے بادشاہی دی ہے وہ بادشاہی جھین بھی سکتا ہے۔ تیرے دماغ پر وہ خون چڑھ گیا ہے جو تو نے دلی کی گلیوں میں بہایا ہے....“

نادر شاہ کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اُس نے خنجر اٹھا کر اس قدر زور سے ستارہ کے ماتھے پر مارا کہ نوک کھوڑی میں اتر گئی۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ نادر شاہ اُس کی حسین پیشانی سے خون بہتا دیکھتا رہا۔ اُس کا جسم کانپنے لگا۔ اُس کا عتاب ماند پڑ گیا۔ وہ جو ایک جابر جنگجو تھا اور ایران کا شہنشاہ تھا، ایک جذباتی آدمی بن گیا۔ اُس نے خنجر چھینک دیا اور پلنگ پر اووندھے منہ کر کہ بہت روتا۔ اس کا ذاتی خادم اور محافظ ابابکی

خیچے میں داخل ہوا۔ اُسے ستارہ سے محبت تھی محنت تھی عقیدت تھی۔ وہ ستارہ کو اٹھائے گیا اور اُسے طبیب کے خیچے میں جاٹا یا۔ ستارہ کے پیچھے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

”کیا مجھے اس کا علاج کرنا چاہیے؟“ طبیب نے پوچھا۔ شہنشاہ ناراض تو نہ ہوں گے؟“

”اگر آپ نے علاج نہ کیا تو خدا ناراض ہوگا۔ آغا باشی نے کہا۔“ آپ ستارہ کو جانتے ہیں۔ کینز سے ملکہ بن کر اس کے دل میں خوف خدا اور انسانوں کا پیار زندہ رہا مگر شہنشاہ گذریے سے شاہ ایران بن کر اپنے بیٹے کے دشمن بن گئے۔ آپ سبیا ہیں۔ اپنے اس فرض کو کبھی جو خدا نے آپ کو سونپا ہے۔ اس کی جان بچائیں در نہ روز قیامت آپ قاتلوں کی صف میں کھڑے ہوں گے۔۔۔ میں آپ کو شہنشاہ کی ناراضگی سے اس طرح بچا سکتا ہوں کہ صبح شہنشاہ سے کہہ دوں گا کہ ستارہ رات مرگئی تھی اور میں رات ہی رات اس کی لاش کو جنگل میں دفن کر آیا ہوں۔“

طبیب نے ستارہ کی مرہم پٹی کر دی۔ آغا باشی نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر رات کو ہی ستارہ کو بہت دور ارمنی خاندان کے ہاں بھجوا دیا۔ ستارہ کئی روز بے ہوش رہی۔ ارمنی خاندان اُس کا احساندہ تھا۔ اس خاندان نے احسان کا صلہ دینے کے خیال سے ستارہ کو سنبھال لیا۔ ستارہ نے آنکھ کھولی تو اُس نے نادر شاہ کی خیریت پوچھی۔ اُسے بتایا گیا کہ وہ نادر شاہ سے بہت دور ہے اور نادر شاہ کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ مر چکی ہے۔

ستارہ کو جو دکھ ہونا تھا ہو اگر نادر شاہ اُس کے غم میں دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ تا سب اور کچھتا و اُسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ اس کی شانہ آب و تاب کبھی جارہی تھی۔ اُس نے شیرازی کو دھتکار دیا تھا۔ حرم کی کوئی عورت اُس کا دل نہ موہ سکی۔ ادھر ستارہ عجیب شش دینچ میں پڑ گئی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ وہ نادر شاہ کے پاس چلی گئی تو اُسے جس آدمی نے بتایا تھا کہ وہ مر گئی ہے وہ نادر شاہ کی تلوار کا شکار ہو جائے گا۔ ان لوگوں میں آغا باشی بھی تھا اور طبیب بھی۔ وہ انہیں جھوٹ کی سزا سے بچانا چاہتی تھی۔

وقت گذر رہا تھا۔ ایک سال گزر گیا۔ نادر شاہ کے ہاتھوں سے عنان حکومت نکلتی جارہی تھی۔ اُس کا دماغ اُس کا ساتھ چھوڑتا جا رہا تھا۔ تخت طاووس اور زرو جواہرات کے انبار اُس کا دل نہ بہلا سکے۔ اُس نے اس حقیقت کو پایا کہ دولت بادشاہ بنا سکتی ہے قلبی سکون نہیں دے سکتی اور بادشاہی اس کے ہاتھوں انسانوں کا خون بہا سکتی ہے کسی ایک بھی انسان کا دل نہیں جیت سکتی۔ نادر شاہ کو یہ کھچتا و پاگل کیے جا رہا تھا کہ وہ ستارہ کا قاتل ہے۔

وہ ایران پہنچ چکا تھا۔ اُس کی دیگرگوں ذہنی کیفیت نے اُس کے دربار میں کچھ دشمن پیدا کر دیے۔ یہ تخت کے ہوس کا رتھے۔ ایک اور سال گزر گیا۔ ایک روز اس ارمنی گاؤں میں جہاں ستارہ رہتی تھی، یہ خبر پہنچی کہ نادر شاہ اپنی فوج کے ساتھ اس گاؤں کے قریب سے گزر رہا ہے۔ ستارہ کے دل نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ نادر شاہ کے پاس چلی جائے۔ وہ تمام خطرے بھول گئی۔ اُسے کسی نے بتایا تھا کہ نادر شاہ کی دعوت ختم ہو چکی ہے اور اُس پر خاموشی طاری رہتی ہے۔

ستارہ نے نادر شاہ کے نام ایک پیغام لکھا اور ایک آدمی کو دے کر اُسے وہ ہیرا بھی دیا جو نادر شاہ نے اُسے دہلی پر فوج کشی کے وقت دیا تھا۔ اُس نے اپنے قاصد سے کہا کہ وہ یہ پیغام اور ہیرا نادر شاہ کے سوا اور کسی کو نہ دے۔

نادر شاہ کا پڑاؤ دور نہیں تھا۔ ستارہ کا قاصد سیدھا نادر شاہ کے پاس گیا۔ نادر شاہ نے ستارہ کا پیغام پڑھا تو اُسے یقین نہ آیا لیکن ہیرا دیکھ کر اُس نے ایک گھوڑے سوار دستے کو حکم دیا کہ جا کر ستارہ کو لے آئے۔



رات کے وقت ستارہ شاہی سواری میں نادر شاہ کے پاس پہنچ گئی۔ نادر شاہ کو جیسے نئی زندگی مل گئی ہو۔ اب وہ مسرت سے دیوانہ ہوا جارہا تھا مگر اُس کی شنشہاہیت کی بنیادوں میں کیڑا لگ چکا تھا۔ ۱۰ مئی ۱۷۴۷ء (۱۰ جمادی الاول ۱۱۶۰ ہجری) کی رات تھی۔ نادر شاہ اور ستارہ اُس خیمے میں تھے جہاں دو سال بعد اُن کی ملاقات ہوئی تھی۔ نادر شاہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ ستارہ یوں جاگ رہی تھی جیسے اس کی حفاظت کر رہی ہو۔ خیمے کے باہر اُسے سرکے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ دبے پاؤں خیمے سے نکلی مگر خیمے کے دوسرے دروازے سے تین آدمی داخل ہوئے۔

ان میں نادر شاہ کا بھتیجا علی ملی خان تھا اور دو آدمی تھے جنہیں ستارہ اچھی طرح جانتی تھی۔ ایک صالح محمد خان تھا اور دوسرا محمد خان قاپچار تھا۔ پیشتر اس کے کہ ستارہ شور و غوغا کرتی، تینوں نے سوئے ہوئے نادر شاہ کا خنجر پرت سے کام تمام کر دیا۔ محافظ باہر آرام اور اطمینان سے کھڑے رہے۔

مسمیٰ نے بائیس فٹوں کو کلم دیا کہ نادر شاہ کی لاش اٹھا کر کہیں دفن کر دو۔ محافظ خیمے میں گئے تو وہاں ایک کی بجائے دو لاشیں پڑی تھیں۔ نادر شاہ کی لاش پر ستارہ کی لاش یوں پڑی تھی جیسے وہ زندہ نادر شاہ سے لپٹی ہوئی ہو۔ اُسے الگ کرنے لگے تو دیکھا کہ ستارہ کے دل میں خنجر اُترا ہوا تھا۔ یہ وہ خنجر تھا جو ستارہ نے اُس وقت نکالا تھا جب نادر شاہ پہلے روز اُسے تختے میں آئی ہوئی کینوں میں دیکھنے نکلا تھا۔ نادر شاہ اور ستارہ کی محبت کی ابتدا اسی خنجر سے ہوئی تھی۔ ستارہ نے یہ خنجر اپنے دل میں اُتار لیا اور نادر شاہ کے ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہوئی۔

نادر شاہ کو اس کے قاتل بھتیجے نے مشہد میں دفن کرایا ستارہ کی قبر کی کچھ خبر نہیں کہاں ہے۔

## پدمنی اور علاؤ الدین خلجی

علاؤ الدین خلجی جابر، سخت گیر اور انصاف پسند بادشاہ اور بہترین سپہ سالار تھا۔ وہ اُن پڑھ ہونے کے باوجود علم دوست تھا۔ اپنی فتوحات اور انصاف پسندی کی وجہ سے وہ ہندوستان کے بہترین حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اُس کی زیادہ تر فتوحات ہندو راجاؤں کے خلاف تھیں۔ اُس نے منگول حملہ آوروں اور باغیوں کے خلاف بھی کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ متعصب ہندو متو خین نے جہاں اس کی فتوحات اور بہترین سپہ سالاری کا اعتراف کیا ہے وہاں اُسے ظالم، سنگدل اور ہندوؤں کا قاتل بھی بتایا ہے۔ علاؤ الدین خلجی دراصل اپنے دشمنوں کو بہت کم معاف کیا کرتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور معمولی نوعیت کے جرائم کی سزا بھی سخت ہوتی تھی۔

ملک میں ہر شے کی قیمت مقرر تھی۔ ان اشیاء میں گھوڑے اور اونٹ بھی شامل تھے۔ ذخیرہ اندوزی اور زائد قیمت وصول کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ علاؤ الدین خلجی کے ایک امیر نے بادشاہ کو اچھے ٹوڈ میں دیکھ کر کہا۔ ”بادشاہ سلامت کو گانے والیوں کی آجڑائیں مقرر کرنی چاہئیں کیونکہ وہ من مانی رقم وصول کرتی ہیں۔“ علاؤ الدین خلجی کو البتہ تاریخ اس لیے کبھی معاف نہیں کر سکتی کہ اُس نے غدار امراء اور بھائیوں کی مدد سے اپنے بیٹے جیپا اور سر سلطان جلال الدین خلجی

کو قتل کروا کر تخت پر قبضہ کیا تھا۔ اپنے چچا کو قتل کرنے کی کئی وجوہات تھیں۔ علاؤ الدین کی بیوی اُس کے اسی چچا کی بیٹی تھی اور بادشاہ کی بیٹی ہونے کے باعث اُس پر رعب جاتی اور زیادہ وقت اُس سے دور گزارتی تھی۔ اس وجہ سے علاؤ الدین نے خفیہ طور پر ایک امیر زادی سے شادی کر لی تھی۔ جب جلال الدین کی بیٹی کو اس کا علم ہوا تو اُس نے ایک دن علاؤ الدین کے سامنے اُس کی دوسری بیوی کی خوب پٹائی کی۔ بادشاہ کی ملکہ یعنی علاؤ الدین کی ساس کو بہت غصہ آیا اور اُس نے علاؤ الدین کی خوب بے عزتی کی۔ علاؤ الدین نے چند مہمات پر اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ملک چھجور کی بغاوت کو کامیابی سے کچل ڈالا۔ اس طرح بادشاہ اس سے بہت خوش اور مرعوب تھا۔ علاؤ الدین ایک صوبے کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد اُس نے دلیشہ، بھلسہ، چندیری اور دیوگری کی امیر ریاستوں کو فتح کر لیا بقول فرشتہ صرف دیوگری سے علاؤ الدین کو چھ سو سو سونا، ایک ہزار من چاندی، سات من موتی، دو من ہیرے اور دیگر جواہرات اور چار ہزار ریشمی کپڑے کے تھان تاوان کی صورت میں ملے تھے۔ رام چند رااجہ دیوگری نے علاؤ الدین کے عقد میں اپنی حسین لڑکی بھی پیش کر دی جو بعد میں شہاب الدین عمر خلجی کی ماں بنی۔

اُدھر سلطان جلال الدین خلجی ۱۲۹۶ء میں اپنی فوج سمیت گوالیار پہنچا۔ وہیں سلطان کو علاؤ الدین کی فتوحات اور بے شمار دولت کے بارے میں علم ہوا۔ وہ بہت خوش تھا مگر چند امراء اور درباریوں نے اُسے علاؤ الدین کے خلاف بھڑکایا کہ اُس نے بغیر اجازت دکن کے علاقے پر حملہ کیا تھا اور یہ کہ علاؤ الدین اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے والا ہے۔ بعض امراء نے علاؤ الدین کو بے ضرر اور وفادار بتایا۔ سلطان جلال الدین بھی اپنے بھتیجے اور داماد کو وفادار سمجھتا تھا، اس لیے اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ علاؤ الدین کو اُس کی شاندار فتوحات پر مبارک باد دینے بذات خود جائے گا مگر علاؤ الدین نے اپنے بھائیوں اور وفادار سالاروں کے مشورے سے سلطان جلال الدین کو قتل کرنے

کا منصوبہ بنالیا کیونکہ اُسے افواہیں موصول ہو رہی تھیں کہ سلطان اُسے قتل کروانا چاہتا ہے، اس لیے کہ علاؤ الدین کی فتوحات نے اُسے طاقت ور اور دولت مند بنا دیا تھا۔

سلطان دریا کے راستے بذریعہ کشتی چند محافظوں اور امراء کے ساتھ علاؤ الدین کی ملاقات کے لیے آیا۔ کشتی میں سے اُس نے علاؤ الدین کی فوج کو لڑائی کے انداز میں تیار پایا۔ سلطان کو بتایا گیا کہ فوج اُس کی تعظیم اور استقبال کے لیے تیاری کی حالت میں ہے۔ سلطان کو کچھ شک گذرا اس لیے اُس نے تیران مجید کی تلاوت شروع کر دی اور باقی امراء اور محافظ بھی سورہ یسین کی تلاوت کرنے لگے کشتی کنارے پر رُکی علاؤ الدین خلجی آگے بڑھا اور سلطان کے قدموں میں گر پڑا۔ سلطان نے خوش ہو کر اُسے اٹھایا اور یقین دلایا کہ وہ اُسے بیٹوں سے زیادہ عزیز ہے۔ سلطان اُس کا ہاتھ پکڑ کر کشتی کی جانب لے جانے لگا مگر پشت سے سلطان پر پے درپے تلواروں کے کئی وار ہوئے اور وہ تمام فوج کے رو برو قتل کر دیا گیا۔ سلطان کے ساتھیوں کو بھی قتل کر دیا گیا۔

ابھی سلطان جلال الدین کا خون سرد بھی نہ ہوا تھا کہ علاؤ الدین کے سر پر تاج رکھا گیا اور یوں جمعہ کے روز ۲۰ جولائی ۱۲۹۶ء (۱۷ رمضان المبارک) علاؤ الدین اپنے نیک اور شفیق چچا کو قتل کروا کر خود سلطان بن گیا علاؤ الدین نے محض قتل پر ہی اکتفا نہ کیا تھا بلکہ سلطان جلال الدین کا کٹا ہوا سر نیزے پر اڑس کر تشہیر کے لیے جگہ جگہ بھجوا دیا گیا۔ علاؤ الدین نے امراء و وزراء، سالاروں اور فوج کے مختلف عہدیداروں میں انعامات اور منصب تقسیم کیے۔ بخشی سے دولت ثانی اور خوب حُسن منایا اور اس طرح بہت جلد علاؤ الدین خلجی نے مضبوطی سے قدم جما لیے۔

جلال الدین خلجی کے وفادار امراء اور سالاروں کو تابع کرنے کے بعد علاؤ الدین مزید فتوحات کی جانب متوجہ ہوا۔ ملتان، جیسلمیر اور دوسرے کئی علاقے فتح کرنے کے بعد اُس کے سپہ سالار نے گجرات کاٹھیاواڑ فتح

کر لیا۔ مہجرات کا راجہ کرن شکست کھا کر بھاگ گیا مگر اُس کی حسین رانی ملادی  
 کہ بے شمار دولت کے ساتھ سلطان علاؤ الدین خلجی کی خدمت میں پیش  
 کیا گیا۔ سلطان نے اُس کو عقد میں لے لیا۔ اس کے بعد اُس کی فوجوں نے  
 رنچھور اور دوسرے کئی علاقے فتح کر لیے۔ وہاں سے بھی بے شمار دولت  
 اکٹھی کی گئی۔ بیشتر مہمات راجپوت حکمرانوں کے خلاف تھیں۔ راجپوتانہ  
 کا بیشتر علاقہ فتح ہو چکا تھا مگر چتوڑ کا مضبوط قلعہ اور علاقہ ابھی باقی تھا۔  
 ۲۸ جنوری ۱۲۰۳ء کو سلطان علاؤ الدین فوج کے ساتھ چتوڑ کی طرف روانہ  
 ہوا۔ حضرت امیر خسرو بھی سلطان کے ہمراہ تھے۔ چتوڑ ریاست میواڑ کا صدر  
 مقام تھا۔ اجیر سے ۱۱۴ میل اور اندور سے ۱۹۱ میل پر واقع ہے۔ قلعہ چتوڑ  
 ہندوستان کے مضبوط ترین قلعوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس قلعے کی لمبائی چوڑائی  
 ۳۱/۲ x ۳۴ میل تھی۔ قلعہ پانچ سو فٹ بلند پہاڑی پر واقع تھا۔ قلعے کا گھیر  
 آٹھ میل تھا جس کے گرد بلند اور مضبوط دیوار تھی۔ اسے ناقابلِ تسخیر سمجھا  
 جاتا تھا۔

چتوڑ کا حکمران رانارتن سنگھ راجپوت تھا جو ہندوستان کے تمام  
 راجاؤں اور حکمرانوں میں بہادری، امانت اور ذات کی بنا پر بلند درجہ رکھتا  
 تھا۔ قلعے کے اندر بہت زیادہ تعداد کی فوج موجود تھی اور سامانِ رسد،  
 خوراک اور اسلحہ وغیرہ بھی ایک سال تک کے لیے کافی تھا۔ سلطان علاؤ الدین  
 نے قلعے کا محاصرہ کر کے تمام راستے کاٹ دیے اور قلعے کی دیواروں کو توڑنے  
 کے لیے بمبیتیں استعمال کیں۔ راجپوت بہادری سے لڑتے رہے۔ تقریباً  
 سات ماہ کی لڑائی کے بعد ۲۶ اگست ۱۲۰۳ء کو قلعہ بند فوج نے بھاری  
 نقصان کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔ اس لڑائی میں تقریباً تیس ہزار راجپوت  
 بمعہ رانارتن سنگھ کے اور بیشتر سالار اور اُمراء مارے گئے تھے۔ لڑائی  
 کے آخری دن رانارتن سنگھ کی حسین رانی پدمی بے شمار عورتوں کے ساتھ  
 سستی ہو گئی یعنی اُس نے ان تمام عورتوں کے ساتھ اپنے آپ کو زندہ جلا  
 ڈالا تھا۔ حضرت امیر خسرو، عبداللہ ملک اسامی اور کئی ہم عصر ہندوؤں نے

کے مطابق رانارتن سنگھ نے بذاتِ خود علاؤ الدین کے سامنے ہتھیار ڈالے  
 تھے اور اُس کی جان بخشی کر دی گئی تھی مگر رانارتن سنگھ کو از حد ذلت کا سامنا  
 کرنا پڑا کیونکہ علاؤ الدین نے ہر شہر میں اُسے لوگوں کے سامنے قیدی کی حیثیت  
 سے پیش کیا۔ اُسے تمام دولت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ہندو متورخین نے رانارتن  
 کی جان بخشی کروانے کی التجا کو بزدلی بتایا ہے۔ اُسے میدانِ جنگ میں مر  
 جانا چاہئے تھا۔ جہاں تک امیر خسرو، ضیا الدین برنی اور دوسرے معاصر مورخین  
 (جن میں ہندو بھی شامل ہیں) کا تعلق ہے انہوں نے پدمی اور علاؤ الدین کے  
 مشہور قصے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

تاریخ میں پہلی مرتبہ پدمی اور علاؤ الدین خلجی کے بارے میں ایک  
 رومانی نظم مسلمان شاعر ملک محمد حبیبی نے ۱۵۴۰ء میں لکھی تھی۔ یعنی چتوڑ فتح  
 ہونے کے ۲۲ سال بعد۔ پہلی مرتبہ پدمی کا قصہ سنا اور پڑھا گیا۔ سلطان  
 علاؤ الدین کو فوت ہوئے ۲۲ سال گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں کسی توخ  
 یا شاعر نے اُس کے متعلق کچھ نہیں لکھا تھا۔ ملک محمد حبیبی نے چتوڑ پر حملے  
 کی وجہ یہ لکھی ہے کہ علاؤ الدین چتوڑ کی حسین رانی پدمی کو حاصل کرنا چاہتا  
 تھا۔ بقول محمد حبیبی چتوڑ کی رانی پدمی پدماتی لنگا کی شہزادی تھی۔ چتوڑ  
 کے رانارتن سنگھ کو پدمی کی خوبصورتی کے بارے میں ایک طوطے سے معلوم  
 ہوا تھا۔ پدمی کو حاصل کرنے کے لیے رانارتن سنگھ نے ایک سادھو گدگدر  
 کا روپ دھارا اور پدمی کے محل کے نواح میں بارہ سال تک گھومتا رہا۔  
 اس طرح پدمی بھی اس کی طرف مائل ہو گئی اور اس کے ہمراہ چتوڑ آگئی۔ ایک  
 مرتبہ ایک اور سادھو گھوٹا بھیک مانگتے ہوئے پدمی کو دیکھا تھا جس  
 نے جا کر علاؤ الدین خلجی کو بتایا کہ چتوڑ کی رانی نہایت حسین ہے جس کا مقابلہ  
 کوئی عورت نہیں کر سکتی اور یہ کہ وہ شاہی حرم کا مہیرا ہوگی۔

سلطان نے رانارتن سنگھ کو چتوڑ کو حکم بھیجا کہ پدمی کو شاہی حرم میں  
 بھیجا جائے۔ رانا کے انکار پر سلطان نے چتوڑ پر حملہ کر دیا مگر مسلسل آٹھ سال  
 لڑائی کے بعد بھی چتوڑ کا قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ سلطان نے قلعے کی مضبوطی کے

زک مہینچانے کے لیے اُسے غیاش اور ہندوؤں کا دشمن بنانے اور راجپوتوں کی بہادری اور رسم سستی کو بلند مقام دینے کے لیے اس فرضی داستان کو بالکل اصل بنا ڈالا۔ اس فرضی داستان کو فرشتہ جیسے عظیم مؤرخ اور اس کے ہم عصر مؤرخ حاجی الدیر نے بھی جگہ دی ہے۔ ان مؤرخین نے ملک محمد حبیبی کی داستان کے ستر سال بعد اپنی تاریخی کتابیں لکھی تھیں، اس لیے آنے والے مؤرخین نے اس داستان کو مستند قرار دیا۔

راجپوتوں کی بہادری کی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے اٹھارہویں صدی کے مشہور انگریز مؤرخ کرنل ٹوڈن نے بھی پدمنی کے قتلے کو درست قرار دیا ہے اور ملک محمد حبیبی کی داستان کو اپنی کتاب میں بیان کیا ہے مگر کسی بھی مؤرخ نے چٹوڑ کے محاصرے کو آٹھ سال نہیں بتایا۔ بقول فرشتہ وغیرہ چٹوڑ کو سلطان نے دوبارہ فتح کیا تھا۔ ایک مرتبہ محاصرہ چھ ماہ تک جاری رہا اور پھر سلطان نے چٹوڑ فتح کرنے کے بعد اسے دلی عہد شہزادہ خضر خان کے سپرد کر دیا اور خود واپس دہلی چلا گیا تھا۔ فرشتہ اور دوسرے ہم عصر مؤرخین لکھتے ہیں کہ رانا رتن سنگھ چٹوڑ کے فتح ہونے کے بعد سلطان کی قید میں تھا سلطان نے پدمنی کی خوبصورتی سے مرعوب ہو کر اُسے شاہی حرم میں شامل کرنے کے لیے رانا رتن سنگھ کی قید سے آزادی کے لیے شرط رکھی تھی۔ رانا رتن سنگھ کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ یہ شرط مان لے۔ رانا رتن سنگھ کی ایک بیٹی نے اپنے باپ کو آزاد کرانے کے لیے پاکلیوں میں سینکڑوں جنگجو راجپوتوں کو چھپا کر سلطان کے محل میں بھجوا دیا اور انہوں نے رانا رتن سنگھ کو آزاد کرالیا۔ رانا پھر چٹوڑ مہینچا اور سلطان کی فوج پر بار بار حملے کر کے اُسے پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ سلطان نے مجبور ہو کر چٹوڑ کا قلعہ رانا رتن سنگھ کے ایک بھانجے کے سپرد کر دیا۔

حاجی الدیر نے لکھا ہے کہ چٹوڑ فتح ہونے کے بعد سلطان نے اُسے رانا رتن سنگھ کی ایک بھانجی کے سپرد کر دیا جس کی ماں سلطان علاؤ الدین کے عہد میں تھی مگر علاؤ الدین کے ہم عصر مؤرخین حضرت امیر خسرو اور ضیاء الدین برنی نے ایسے کوئی واقعات نہیں لکھے۔ رانا رتن سنگھ کا بارہ سال تک اپنے علاقے سے

پیش نظر اپنا مطالبہ ترک کر دیا مگر رانا سے التجا کی کہ پدمنی کی صرف ایک جھلک اُسے آئینے میں دکھا دی جائے۔ رانا رتن سنگھ مان گیا۔ پدمنی کا عکس دیکھنے کے بعد سلطان نے رانا کو مہانے سے قید کر لیا اور اُسے دہلی لے گیا۔ سلطان نے دہلی پہنچ کر اہل چٹوڑ کو حکم بھیجا کہ رانی پدمنی کو سلطان کے حوالے کیا جائے تبھی رانا رتن سنگھ کو آزاد کیا جائے گا۔ قیدی راجہ کو بہت اذیت دی جا رہی تھی۔ اسی اثنا میں چٹوڑ کی ایک قریبی ریاست کے راجہ دیو پال نے پدمنی کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ رانی پدمنی عقل مند بھی تھی۔ اُس نے دہلی جانا منظور کر لیا کیونکہ اُس نے رانا رتن سنگھ کو آزاد کرانے کے لئے ایک ترکیب تیار کر لی تھی، مگر اپنے ہمراہ وہ ۹۰۰ پالکیاں سامان سے بھری ہوئی لائی جن میں دراصل چٹوڑ کے بہادر راجپوت جنگجو سپہ سالار بھی تھے۔ دہلی پہنچ کر پدمنی نے سلطان سے استدعا کی کہ وہ رانا رتن سنگھ سے آخری ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ اُسے اجازت دے دی گئی۔ جو نہی پدمنی کے ہمراہ آئی ہوئی پالکیاں محل کے اندر داخل ہوئیں تو ان میں سے بہادر راجپوت تواریں نکال کر باہر آگئے اور فوراً رانا رتن سنگھ کو قید سے آزاد کر کے رانی پدمنی سلطان کی فوج سے لڑتے ہوئے چٹوڑ پہنچ گئے۔ سب سے پہلے رانا رتن سنگھ نے راجہ دیو پال کے علاقے پر حملہ کیا اور اُسے قتل کر کے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا، مگر دیو پال کے علاقے پر حملے کے دوران رانا رتن سنگھ زخمی ہو گیا تھا اور زخموں کی وجہ سے مر گیا۔ اس کے مرنے پر رانی پدمنی نے آگ میں کود کر سستی کی رسم ادا کی اور یوں پدمنی بھی بہادری کی موت مر گئی۔

ملک محمد حبیبی کی اس فرضی رومانی داستان کو لوگوں نے بہت پسند کیا اور بہت جلد یہ تمام ملک میں اشتیاق سے پڑھی جانے لگی پھر یہ داستان نسل در نسل پھیلتی گئی جسے بے شمار شاعروں اور مؤرخین نے نقل کیا اور زیب داستان کے لیے اس میں مزید اضافہ بھی کیا۔ ہندو شاعروں اور مؤرخین نے سلطان علاؤ الدین کی ہندوؤں کے خلاف فتوحات کی شہرت کو



باہر رہنا اور سادھو گد اگر بن کر لنکا جا کر پدمنی کو حاصل کرنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں حکمران چند ماہ بھی پایہ تخت سے دور نہیں رہتے تھے کیونکہ اُن کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر کئی حریف اور وارث تخت پر قبضہ کرنے کے لیے ابھرتے تھے۔ اس کے علاوہ پدمنی یقیناً تیس سال سے اوپر تھی جب لنکا سے لا کر رانا تن سنگھ نے اُسے اپنی بیوی بنایا تھا۔ جب سلطان علاؤ الدین نے اُسے آئینے میں دیکھا تب پدمنی کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ یا اوپر تھی۔ بہر حال پدمنی کا قصہ ایک افسانہ ہے اور سلطان علاؤ الدین کا اس میں ملوث ہونا سراسر بے بنیاد اور غلط ہے۔ بعد کے ہندو مورخین نے تعصب پھیلانے اور راجپوتوں کی بہادری کے کارنامے اُجاگر کرنے کے لیے اور مسلمان حکمرانوں کو بدنام کرنے کے لیے اس قصے کو بہت اہمیت دی اور تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر خاص طور پر کیا۔ آزادی کے بعد کے کئی ہندو مورخین نے اس قصے کے بارے میں بہت تحقیق کے بعد ثابت کر دیا ہے کہ پدمنی اور سلطان علاؤ الدین کا قصہ من گھڑت ہے۔ میٹیر مورخین نے (جن میں ہندو بھی شامل ہیں) سلطان علاؤ الدین کے بارے میں تصدیق کی ہے کہ اُسے حرم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ اُسے شادی کرنے اور بصورتِ عورتوں کو اکٹھا کرنے کا شوق تھا۔ اگر وہ عیاش ہوتا تو اتنی فتوحات کبھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی پسندیدہ بیوی مہر دھنی تھی۔ اس کے علاوہ راجہ کرم دیو کی بیٹی کلادیوی بھی اُس کی بیوی تھی جو اُسے پسند تھی۔



## مرتے باپ کی بددعا

تبخور کے بڑھے مہاراج ادھیراج راجہ شیواجی کے چہرے پر موت کی نقابست اور زردی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ انت اور انجام کا لمحہ قریب آگیا تھا۔ سانس اُکھڑ رہی تھی۔ محل کے کمروں سے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مہاراجہ شیواجی کو یہ علم نہ ہو سکتا تھا کہ رونے والی بیشتر عورتیں اُس کی طرف بڑھتی ہوئی موت کے صدمے اور غم میں مین کر رہی ہیں یا اپنی بے بسیوں پر آنسو بہا کر نالہ و فریاد کر رہی ہیں۔

راجہ شیواجی نے تبخور کے تخت پر چالیس برس تک بیٹھ کر اس طرح حکومت کی تھی کہ کوئی اس کے حکم کی سرِ تابی کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ کسی میں اتنی بہت نہ تھی کہ اُس کی اجازت کے بغیر پر بار سکتا۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ پیدا ہوتے ہی جیسے اُس کے کان میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ وہ راجہ کا ہے اور اس اتنی بڑی ریاست کا وارث اور ان لاکھوں انسانوں کا آقا ہے۔ اُس نے ہوش سنبھالا تو خدَم اُس کے جلو میں رہتے اور اس کی خوشنودی کا پورا خیال رکھتے تھے۔ اُس کے دل میں یہ بات پختہ ہو گئی کہ وہ ان سب کا مالک ہے، سب سے برتر ہے اور یہ سب حقیر اور بیچ ہیں۔ اُس نے ان ملازموں پر ظلم و ستم کرنے شروع کر دیے۔ کسی کو لات مارتا کسی

کو ٹھانچہ، محسی کو مُرنانا دیتا، محسی کی عزت اس کے ہاتھوں محفوظ نہ رہی تھی۔ بڑے بڑے درباری بھی اس سے پناہ مانگنے لگے۔ وہ جس کو چاہتا ذلیل کر دیتا۔ وہ سب اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اپنے راجہ رشیواجی کی جو ہونے والا راجہ تھا، ہر سلوک اور ہر گستاخی برداشت کریں۔

راجہ رشیواجی کے باپ نے اُس کو تعلیم دلوانے کے لیے بڑے بڑے نامی استادوں کو جمع کیا لیکن رشیواجی کو علم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بہت سے شریف استاد تو اپنی عزت بچا کر کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ اسے پڑھانے میں لگے رہے مگر ان کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔

جب رشیواجی کی عمر پندرہ برس ہوئی تو وہ محل کی خوبصورت بانویوں، کینزروں اور دربار کے عملے کی خوبصورت بیویوں اور بیٹیوں میں دل چسپی لینے لگا۔ اُس نے ساری عمر انہی نازک اور گرم آغوشوں میں پرورش پائی تھی۔ جب وہ جوان ہوا تو وہ ان سب پر اپنا حق جتانے لگا۔

اندھی جوانی بے لگام ہو گئی، پھر اس جوانی کو راج کا لشہ بھی چڑھا ہوا تھا۔ وہ ریاست تنجور کا راجہ راجہ تھا۔ ماں مر چکی تھی۔ باپ کو اپنی رنگ رلیوں سے فرصت نہ ملتی تھی۔ ریاستوں کے راجے مہاراجے اسی

طرح حکومت کیا کرتے تھے۔ راجہ رشیواجی کو کوئی رد کرنے والا نہیں تھا۔ جوانی کا گرم خون اور ریاست کی ملکیت، ان دونوں نشوں نے مل جل کر اس کو عصمتوں کا لیٹر بنا دیا۔ اس کے ذاتی ملازم اس کی خوشنودی کے لیے ریاست کے اندرونی علاقوں سے اس کے لیے خوبصورت لوکیاں خرید کر اور انخوا کر کے لانے لگے۔

جب وہ انیس برس کا ہوا تو اس کا باپ مر گیا۔ اب وہ رسم اور قانون کے مطابق ریاست تنجور کا والی اور راجہ تھا۔

انیسویں صدی کا ابتدائی عشرہ ختم ہو چکا تھا۔ اُس وقت ہندوستان کے سیاسی حالات بڑے خراب تھے۔ ریاستوں کے راجے اور نواب مطلق العنان تھے لیکن ان کی جڑیں کمزور ہو چکی تھیں۔ اسٹانڈیا لپنسی کا

تسلط اور پھیلاؤ ڈبھٹا چلا جا رہا تھا۔ انگریزوں کی اس کمپنی نے مختلف حربوں اور بہانوں سے ہندوستان کے مختلف علاقوں پر اپنی بالادستی قائم کر دی تھی۔ اپنے راستے کے کئی روڑے اور حریف ایسٹ انڈیا کمپنی نے صاف کر دیئے تھے۔ ہندوستان ایک ایسے موڑ پر کھڑا تھا جہاں سے غلامی کا دور شروع ہونے والا تھا۔ مغل سلطنت اندر سے کھو کھلی ہو چکی تھی۔ حکومت اور اقتدار کا چراغ ٹٹھار رہا تھا۔

تنجور کی ریاست کے حالات بھی ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے مختلف نہ تھے۔ رعایا غریب، بے بس، راجہ کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہی تھی کسی کو راجہ کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہ تھی۔ لوگ

راجہ کے مرنے پر خوش نہ ہوئے کیونکہ وہ راجہ کے لپچن اُس کے بچپن اور لڑپن ہی میں دیکھ چکے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مہاراجہ رشیواجی اپنے باپ سے بھی زیادہ عیاش، ظالم اور بدکار ہو گیا ہے لیکن لوگ کیا کر سکتے تھے؟ ان کے بس میں کچھ نہ تھا، نہ وہ فریاد کر سکتے تھے نہ وہ انصاف طلب کر سکتے تھے کیونکہ جس کے سامنے فریاد کی جاسکتی تھی اور جس سے انصاف طلب کیا جاسکتا تھا وہ خود ظالم اور بدکار تھا۔

انیس برس کی عمر میں رشیواجی ریاست تنجور کا والی بنا تو ساری ریاست میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ چراغاں کیا گیا۔ لوگوں میں مٹھائیاں تقسیم ہوئیں لیکن ان سارے ہنگاموں اور دھوم دھڑکوں کے باوجود لوگ خوش نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان روشنی کے چراغوں میں ان کا خون جل رہا ہے اور جو مٹھائیاں ان میں تقسیم کی گئی ہیں ان کی بھاری قیمت جلد ہی اُن سے وصول کر لی جائے گی۔

رشیواجی جب راجہ راجہ تھا تو اُس وقت بھی وہ فضول خرچ اور عیاش تھا۔ ریاست کا مطلق العنان راجہ اور مالک بن گیا تو اس کی عیاشی اور فضول خرچی کی کوئی حد نہ رہی۔ دوسری ریاستوں کے راجے مہاراجے جن کی عمر ظلم و ستم کرتے اور داد عیش دیتے گزری تھی وہ بھی محسوس کرنے

لگے کہ یہ کل کا نوٹ اُن سے بھی آگے جا رہا ہے اور ان سے بھی بڑا عیاش ہے۔ راجہ شیواجی کو ریاست کے امور سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اُس نے یہ کام اپنے ایک دیوان نندلال کو سونپ دیا تھا۔ نندلال لومڑی کی طرح

مکار اور چالاک برہمن تھا۔ راجہ شیواجی کا حکم تھا کہ ریاست کا خزانہ ہمیشہ بھرا رہنا چاہئے اور نندلال نے اس کے حکم کی پوری طرح تعمیل کی بلکہ اپنے اختیارات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس نے خود بھی دولت سے گھر بھر لیا تھا۔ ریاست کی رعایا پر نئے نئے ٹیکس لگا دیے گئے جھگڑوں اور مقدموں کے فیصلے کرتے وقت ریاست فریقین سے نہ صرف یہ کہ شبہی خزانے کے لیے خیر رقم بلکہ رشوت بھی لیتی تھی۔ راجہ شیواجی کو ان معاملوں سے کوئی غرض نہ تھی کہ اُس کے اعلیٰ افسر اور محکمے کیا کر رہے ہیں۔ وہ پیش و عشرت میں گم ہو گیا تھا۔

اُس کی عیاشی اور بدکاری کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ لکھنؤ، کلکتہ اور دہلی جیسے بڑے شہروں کی طوائفیں اور دو دنیاں قسمت آزمائی کے لیے تجور کا رخ کرنے لگیں۔ تجور کے راجہ شیواجی کے حکم سے ایک خاص شاہی مہمان خانہ تعمیر ہوا۔ اس میں راجہ شیواجی کے ان جن مہمانوں اور ان کے لواحقین کو بٹھرایا جاتا تھا۔

چوبیس برس کی عمر میں راجہ شیواجی کے دیوان اور درباریوں نے مشورہ دیا کہ اُسے اب شادی کر لینی چاہئے۔ راجہ شیواجی نے اس مشورے کا مذاق اڑایا اور کہا کہ وہ آزاد چھپی ہے۔ شادی کے جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیوان اور درباریوں نے کہا کہ ریاست کو ایک راجا کی ضرورت ہے اور رعایا کی بھی یہی خواہش ہے۔ رعایا کی خواہش کا احترام کرنا چاہئے۔

راجہ شیواجی نے اپنی زندگی میں جس بات کو پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ سوچا وہ یہی بات تھی۔ اُس نے سوچا کہ واقعی ریاست کو ایک راجا چاہیے۔

ریاست تجور ایک بڑی ریاست ہے۔ میرے بعد میرا نام اسی طرح زندہ رہ سکتا ہے کہ میرا ایک بیٹا ہو۔ ملکیت کے شدید احساس نے اس عیاش لاج کو شادی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ راجہ شیواجی نے دوسرے دن اپنے دیوان کو حکم دیا کہ اُس کے لیے کوئی ایسا رشتہ تلاش کیا جائے جو راج محل کے لیے ہر لحاظ سے موزوں ہو۔

دیوان نندلال نے اپنے ذہن میں ایک نقشہ بنایا۔ راجہ کی شادی کسی راجے کی بیٹی سے ہو سکتی ہے۔ اُس نے تمام ہندو ریاستوں کی ایک فہرست تیار کی۔ پھر یہ دیکھا کہ کس ریاست کے راجے کی کتنی بیٹیاں ہیں۔ ان میں سے کتنی ایسی ہیں جو شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہیں اور وہ کسی ہیں۔ مزید معلومات کے لیے اُس نے اپنے ہر کارے ان ریاستوں میں بھیجوائے۔ ایسی عورتیں جن پر اعتماد کیا جاسکتا تھا، ان کو ان ریاستوں میں بھیجا دیا گیا تاکہ وہ ان شہزادیوں اور راجا کیوں کو دیکھ کر بتا سکیں کہ ان کی صیغ عمر یہ کیا ہیں۔ اُن کے خدو خال کیسے ہیں۔

مختلف ریاستوں کی راجا کیوں کے بارے میں تفصیلی رپورٹیں دیوان نندلال کو ملنے لگیں۔ آخری فیصلہ تو راجہ شیواجی کو ہی کرنا تھا لیکن وہ اپنے طور پر ہر طرح کی معمولی سے معمولی معلومات بھی حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب راجہ شیواجی کو اُس کے ایک خاص آدمی نے بتایا کہ تجور ریاست کے ایک گاؤں میں ایک مسلمان لڑکی اتنی خوبصورت ہے کہ اُسے صرف اور صرف راجہ شیواجی کی خواب گاہ کی زینت بننا چاہئے۔ اس دلال نے اس مسلمان لڑکی کی خوبصورتی کی تعریف کچھ اس انداز سے کی کہ راجہ شیواجی نے حکم دیا کہ اس لڑکی کو اُس کے محل میں لایا جائے۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ لڑکی پر سختی نہ کی جائے۔ اس کے گھر والوں کو خرید لیا جائے۔ یہ حکم بھی صادر ہوا کہ لڑکی کے گھر پر اس طرح پہرہ لگا دیا جائے کہ گھر والوں کو علم نہ ہو۔ راجہ شیواجی یہ نہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی کو کوئی

دوسرا مرد چھو بھی لٹکے۔

ریاست تنجو رہندوؤں کی ریاست تھی۔ مسلمانوں کی آبادی ریاست میں آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ مسلمان مجبوری کے عالم میں وہاں رہتے تھے۔ اپنی چھوٹی بڑی زمین کو چھوڑ کر کہیں اور نہ جاسکتے تھے۔ تنجو کے اس چھوٹے سے گاؤں میں چند مسلمان گھرانے تھے۔ ان میں ایک گھرانہ نذیر بیگ کا تھا۔ یہ مغل تھے لیکن حالات کے ہاتھوں مجبوراً زمینداری کرتے تھے۔ انہوں نے راجے کی فوجی ملازمت ترک کر دی تھی۔ ان کی غیرت گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ ہندو راجہ کی چاکری کریں۔ نذیر بیگ کا ایک بیٹا تھا مجید بیگ اور ایک بیٹی تھی حمیدن۔ حمیدن کی عمر اُس وقت سولہ سترہ برس تھی۔ اُس کے والدین کو اُس کی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ وہ کسی موزوں رشتے کی تلاش میں تھے۔ حمیدن بلاشبہ لاکھوں میں ایک تھی۔ قدرت نے اُسے بلا کا حسن بخشا تھا۔ وہ سخت پردے کی پابند تھی گھر سے کبھی نہ نکلتی تھی لیکن اس کی خوبصورتی کا چرچا گاؤں میں ہوتا ہوا اب راجہ شیواجی تک جا پہنچا تھا۔

راجہ کا ہر کارہ جب نذیر بیگ سے ملتا تو نذیر بیگ ایک ہندو کی زبان سے اپنی بیٹی کا نام سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ اُس نے راجہ کے سرکاری گناشتے کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ راجہ کا گناشتہ ناراض تو بہت ہوا لیکن اُسے راجہ کا حکم پورا کرنا تھا۔ وہ نذیر بیگ کو دھمکیاں دے کر چلا گیا۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ راجہ سے جا کر سارا ماجرا بیان کرے گا اور راجہ شیواجی اپنے سپاہی بھیج کر حمیدن کو اغوا کر لیں گے۔

نذیر بیگ گھر میں داخل ہوا تو وہ کانپ رہا تھا۔ راجہ شیواجی کی بکاریوں اور ظلم و ستم کی داستانیں وہ سن چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب تمنا زلزلے والی ہے۔ مغل خون جوش میں آچکا تھا لیکن ہاتھ پٹے کچھ نہ تھا۔ وہ اکیللا راجہ کی طاقت سے نمکڑا نہ سکتا تھا۔ بیوی نے اُس کو پریشان دیکھ کر بہت کر دیا۔ بہت پوچھا لیکن نذیر بیگ نے اُسے کچھ نہ بتایا۔ جب شام ہو گئی تو اُس نے

اپنی بیوی اور جوان بیٹے کو علیحدہ لے جا کر ساری بات سنا دی۔ بیوی اور بیٹے کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ راتوں رات ریاست سے نکل جائیں۔ جو جمع ہوئی زیر تھا اسے ایک پوٹلی میں باندھا اور یہ لوگ اپنے آبائی گھر اور زمین کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چل دیے۔ عزت اور آبرو کے لیے یہ قربانی دینا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ تو گھر سے نکل پڑے لیکن انہیں یہ علم نہ تھا کہ اُن کی باقاعدہ نگرانی کی جا رہی ہے۔

جونہی وہ گھر سے نکلے، دو پہر یار اُن کے پیچھے چل پڑے۔ گاؤں کی حدود سے وہ باہر نکلے تو پہر یاروں نے انہیں لٹکارا۔ نذیر بیگ خطرہ محسوس کیا۔ اُس نے ایک منٹ میں فیصلہ کر لیا۔ بیوی اور بیٹے سے کہا کہ وہ بھاگ نکلیں۔ خود اپنی بیٹی حمیدن کے ساتھ وہ پہر یاروں کی بات سننے کے لیے رک گیا۔ اُس نے صبح فیصلہ کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ پہر یار قریب آ کر حمیدن پر ہاتھ ڈالتے نذیر بیگ نے تنجو نکال کر حمیدن کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ چاند جیسی خوبصورت بیٹی ان کے سامنے خون میں نہا گئی اور دم توڑ گئی۔ نذیر بیگ نے وہی تنجو اپنے پیٹ میں گھونپ لیا اور مڑ کر دیکھا۔ اُس کی بیوی اور اُس کا بیٹا نظروں سے اچھل ہو گئے تھے۔ مرنے سے پہلے نذیر بیگ کے منہ سے نکلا:

”یا خدا! میں نے اپنی عزت محفوظ رکھنے کے لیے اپنی بیٹی کی اور اپنی جان دے دی ہے۔۔۔۔ میں سرخرو ہوا۔ میرے خدا میری دعا ہے کہ یہ بدکار جس ریاست پر مغرور کرتا ہے یہ اس سے چھین جائے۔“

نذیر بیگ تو یوں قربانی دے کر سرخرو ہوا۔ اُدھر راجہ شیواجی غصے میں بھرا ہوا تھا۔ حمیدن جیسی خوبصورت دوشیزہ اُس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اُس نے پہر یاروں کو بلوایا۔ پہر یاروں نے حرف بہ حرف اُس کو بتا دیا اور نذیر بیگ نے مرنے دم جو دعا کی تھی وہ بھی اُسے سنا دی۔ راجہ شیواجی پر اس بددعا کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اُس نے مقصد لگا کر بات کو



ایک کان کو سنا دوسرے کان سے نکال دیا۔

راجہ شیواجی پچیس برس کا تھا کہ اس کی شادی ریاست راجکوٹ کی راجکاری رادھا سے ہو گئی۔ راجکوٹ ریاست کا راجہ اولادِ نرینہ سے محروم تھا۔ اُس کی صرف یہی ایک بیٹی تھی جو اگرچہ زیادہ خوبصورت نہ تھی لیکن اپنے جہیز میں پوری ریاست راجکوٹ لائی تھی کہ راجہ کی موت کے بعد اُسے ہی ریاست کو سنبھالنا تھا اور اُس کے بیٹے کو ہی ریاست تنجوڑ اور ریاست راجکوٹ کا ایک دن راجہ بننا تھا۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ راجوں نوابوں نے اس میں شرکت کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا بھی ایک نمائندہ شادی میں شریک ہوا۔ اُس سے زمانے میں لاکھوں روپے اس کی شادی پر اٹھائے گئے کئی دنوں تک جشن رہا۔ راجہ شیواجی نے بھی چند دنوں کے لیے دوسری عورتوں سے منہ پھیر لیا۔ اب اُسے اپنے وارث کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ محسوس ہو رہی تھی کیونکہ راجکوٹ کی ریاست بھی تو اب اُس کی ریاست بن گئی تھی۔

چند دنوں کے بعد شیواجی پھر اپنے پرانے راستے پر چلنے لگا۔ نڈیرنگ کی بددعا کو وہ بھول چکا تھا۔ اُس نے اُسے غور سے سنا ہی نہ تھا۔ راجہ شیواجی تیس برس کا ہو گیا تھا لیکن اس کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ دنیا بھر کے حکیم، وید اور سیانے بلائے گئے، حتیٰ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ایک انگریز ڈاکٹر اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو بھی راجہ کی درخواست پر بھیجا لیکن سب نے ایک ہی فیصلہ دیا کہ نہ تو راجہ میں کوئی خرابی ہے نہ ہی اس کی بیوی میں لیکن اولاد بھر بھی پیدا نہ ہو رہی تھی۔

پینتیس برس کی عمر میں راجہ شیواجی کا مزاج بے حد چڑچڑا ہو گیا۔ اولاد کی کمی آسب بن کر اُس پر سوار ہو گئی۔ شراب تو وہ پینے بھی پیتا تھا، اب وہ دن رات شراب کے نشے میں دھت رہنے لگا۔ وہ ایک بیٹے، اپنے ایک وارث کے لیے ترس رہا تھا۔ جب وہ ۳۸ برس کا ہوا تو اُس کی رانی مر گئی۔ ایک تو وہ اپنے شوہر کی بے بہرہی کے ہاتھوں تنگ

تھی، دوسرے اولاد نہ ہونے کے غم نے اُسے روگ لگا دیا تھا۔ وہ تیس برس میں اپنے انجام کو اسی طرح پہنچی کہ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔

راجہ شیواجی مایوسی اور غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اب جوانی کا دم غم بھی ختم ہو چکا تھا۔ شراب کی زیادتی نے اس کی صحت کو گھٹن کی طرح چاٹنا شروع کر دیا تھا اور وہ اب اپنی صحت سے بھی مایوس ہو رہا تھا۔ وارث نہ ہونے کے دکھنے اس کی زندگی میں زہر بھر دیا تھا۔

دیوان نندلال کا گھر دولت سے بھرتا جا رہا تھا۔ راجہ شیواجی تو نام کا راجہ رہ گیا تھا۔ دیوان نندلال کا یاں اور محتاط برہمن تھا۔ وہ راجہ کا وفادار تھا اور اُس کا نامہ وفادار رہا۔ اُس نے راجہ کے خلاف کوئی سازش نہ کی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ راجہ نہیں بن سکتا، اس لیے جتنی دولت جمع کر سکتا ہے اتنی جمع کر لینی چاہتے۔ اُس نے دولت کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ریاست کے بیرونی امور کے کچھ ٹھیکے دے دیے۔ ایک بھاری رقم قرض لے کر خود ہڑپ کر گیا اور اُسے ریاست کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اب ریاست تنجوڑ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط بڑھنے لگا۔

راجہ شیواجی کو شراب نوشی کے باوجود اولاد کا غم کھاتا تھا۔ دیوان نندلال نے تیس سے ایک سادھو کو تلاش کر لیا جس نے راجہ شیواجی کو ملاقات کے دوران بتایا کہ راجہ کے گھر ایک ہی صورت میں اولاد ہو سکتی ہے۔ اس سادھو نے جو کچھ بتایا راجہ شیواجی اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ سادھو کو دل کھول کر نذر نیا ز دے کر رخصت کر دیا گیا۔ راجہ شیواجی نے دیوان نندلال کو حکم دیا کہ سادھو نے جو کچھ بتایا ہے اس کو پورا کرنے کی تیاریاں کی جائیں۔

راجہ شیواجی کی عمر اب چالیس برس ہو چکی تھی۔ پوری انسانی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی جگہ انوکھا اور منفرد ہے کہ شیواجی نے ایک ہی دن سترہ

لوکیوں سے شادی کی۔ یہ تاریخ کا ایک سچا اور حقیقی واقعہ ہے جسے کسی طرح بھی جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اس سادھو نے راجشیواجی کو یہی نسخہ بتایا تھا کہ وہ ایک ہی دن سترہ لوکیوں سے شادی کرے۔ ان سترہ لوکیوں میں سے ایک لڑکی اُس کے ریاست کے وارث اور راجکار کی ماں بنے گی۔

۱۸۴۹ء میں مئی کی اکیس تاریخ کو راجشیواجی کے محل میں ایک ایسی تقریب ہوئی جس کی مثال پوری انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سترہ: ان، خوبصورت، کنواری لڑکیاں ریاست کے گوشے گوشے سے ڈھونڈ کر لاؤ گئیں۔ ان کی حیثیت بکریوں سے زیادہ نہ تھی جنہیں ایک قصاب کے ہاتھ بیچ دیا گیا تھا۔ یہ سترہ جوان خوبصورت کنواری لڑکیاں سب کی سب ہندو تھیں۔ اچھے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ راجے ان کے والدین کو بھاری انعام دیا تھا اور وہ خود بھی اس لالچ میں آگئے تھے کہ ان کی بیٹیاں ریاست کے محل میں رانی بن کر راج کریں گی اور لڑکی کے ماں اور باپ یہ سمجھتے تھے کہ اُسی کی لڑکی راجکار کی ماں بنے گی۔

۲۱ مئی ۱۸۴۹ء کو سہ پہر کے وقت خالص ہندو رسم کے مطابق راجشیواجی نے بیک وقت ان سترہ لوکیوں سے شادی کی۔ راجشیواجی کے کرتے کے ساتھ ہر لڑکی کی ساڑھی کا کوڑا باندھا گیا تھا۔ اس طرح ان سترہ لوکیوں نے بیک وقت ہندوؤں کی رسم کے مطابق آگ کے گرد سات سات پھیرے لیے اور وہ راجشیواجی کی بیویاں بن گئیں۔

راجشیواجی بیک وقت سترہ بیویوں کا شوہر تھا۔ اُس کی عادات بدل گئیں۔ شراب میں کچھ کمی واقع ہو گئی۔ وہ ایک وحشی بن گیا۔ بیویوں کو گالیاں دیتا کہ وہ جلدی سے ماں بن جائیں۔ وقت گزرتا گیا۔ نو ماہ گزر گئے۔ ایک سال گزر گیا۔ دو سال گزر گئے۔ ان سترہ لوکیوں میں سے کوئی لڑکی ماں بننے والی نظر نہ آئی۔ مایوسی، غصے، بے بسی اور بے چارگی نے راجشیواجی کو مجبور کر دیا کہ وہ پھر شراب میں ڈوب جائے۔ اُس کی صحت جواب سے

گئی تھی اور اب ۱۸۵۵ء میں فردری کے مہینے میں وہ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اُسے سترہ بیویوں کا شوہر بنے پچھ برس ہو چکے تھے لیکن ان چھ برسوں میں ایک لڑکی نے بھی ریاست کا راجکار پیدا نہ کیا۔

محل کے اندر سے ان سترہ بیویوں کے بین کی آواز آرہی تھی۔ راجشیواجی بستر مرگ پر آخری سانس لے رہا تھا۔ مرتے مرتے اُسے اچانک یاد آیا کہ ایک بار اُس نے ایک مسلمان کی بیٹی کو اغوا کرانے کی کوشش کی تھی اور اس مسلمان لڑکی کے باپ نے اپنی بیٹی کے ساتھ اپنی جان دے کر اُسے بددعا دی تھی۔ اب وہ بددعا پوری ہو رہی تھی۔ چند منٹوں کے بعد راجشیواجی، تنجور کا آخری حکمران مر گیا۔ چند منٹوں کے بعد۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریاست تنجور پر قبضہ کر لیا۔



## مار کوئی اور مادرِ وطن

PDF

رگستان جو میرے سامنے اور میرے ارد گرد پھیلا ہوا ہے، یہی میری دُنیا ہے، یہی میری زندگی ہے۔ مجھے اسی رگستان میں مرنا ہے۔ یہ ریت میرے خون کی پیاسی نہیں لیکن میں اسے اپنا خون پلاؤں گا۔ الجزائر کے مجھ جیسے بے شمار بیٹے اس رگزار کو اپنا خون پلا چکے ہیں۔ یہ رگستان ہمارا ہے، فرانسیسیوں کا نہیں۔ اپنے وطن کی ریت غیروں کے دس کے سونے سے زیادہ قیمتی اور مقدس ہوا کرتی ہے۔

میں ایسی باتیں نہیں جانتا تھا۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ الجزائر میرا وطن ہے اور اس پر فرانسیسی قبضہ کر کے ہمارے بادشاہ بنے ہوئے ہیں۔ وہ ہماری زمین کی پیداوار کے مالک ہیں، ہماری عزت اور ہمارے وقار کے مالک ہیں۔ پھر میں یہ بھی جانتا تھا کہ میری قوم کے بزرگوں اور جوانوں نے فرانسیسیوں سے اپنا وطن چھڑانے کے لیے سنج جنگ شروع کر دی ہے اور اس جنگ کو ہمارے بادشاہ بغاوت کہتے ہیں اور اس جرم کی جو سزا دیتے ہیں، تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میرا باپ عرصہ اڑھائی سال سے گھر سے غائب ہے اور میری ماں کو اس کا کوئی غم نہیں۔ ماں نے مجھے بتا دیا تھا کہ میرا باپ اُن لوگوں کے ساتھ چلا گیا ہے جو فرانسیسیوں کے خلاف لڑ رہے ہیں، کٹ

book.com/urdunovelspdf

رہے ہیں قید ہو رہے ہیں، فرانسیسی پولیس کی اذیتیں سہہ رہے ہیں جو وہی سہہ سکتے ہیں جن کے دلوں میں اپنے وطن کی محبت نہیں عشق ہوتا ہے اور وہ اپنی منڈیر پر اپنا جھنڈا لہرانے کی قسم کھا لیتے ہیں۔

پھر بہت سی باتیں مجھے اپنے باپ نے بتائی تھیں۔ انہیں میں خواب کی باتیں سمجھا تھا، جیسے خواب میں باپ آیا اور میرے خون کو گرما گیا تھا۔ ماں نے دوسرے دن بتایا تھا کہ میرا باپ واقعی آیا تھا۔ یہ دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اُس وقت میری عمر پندرہ سال اور شاید دو تین مہینے اوپر ہو چکی تھی۔ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ باپ نے مجھے جگایا۔ بڑی شکل سے میری آنکھیں کھلیں۔ میری ماں باپ کے پاس کھڑی تھی۔ میں باپ کے گلے لگ گیا تھا۔ اُسے میں ایک عرصے بعد دیکھ رہا تھا لیکن میری آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں اور میرا باپ تیز تیز بول رہا تھا۔ مجھے اُس کے الفاظ یاد ہیں۔ جو یاد نہ رہے وہ ماں نے بتا دیئے تھے۔

مجھے اُس رات پتہ چلا کہ میرا باپ گرفتار ہو گیا تھا۔ پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرا باپ معمول آدمی نہیں تھا۔ کسٹم کے محکمے میں افسر تھا۔ فرانسیسی زبان اپنی زبان کی طرح بولتا تھا۔ اُس نے مجھے اُس سکول میں داخل کرایا تھا جس میں افسروں اور امیروں کے بچے پڑھا کرتے ہیں۔ چوتھے سٹینڈرڈ تک پچھتاں بھی ہمارے ساتھ پڑھا کرتی تھیں۔ ان میں فرانسیسیوں کی بچیوں کے علاوہ اٹلی، سپین، جرمنی اور انگریز کی بچیاں بھی تھیں اور ان میں الجزائر کی مسلمان بچیاں اور بچے بھی تھے۔ یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں امیر گھرانے کا بچہ تھا اور افسر کا بیٹا۔

اور میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ قوم کے امیر لوگ اور لیڈر اگر یہ سمجھ بیٹھیں کہ بڑا نام نہاد اور قربانی دینا صرف غریبوں، مزدوروں اور چھوٹے طبقے کے لوگوں کا کام ہے تو ایسی قوم ہمیشہ بدعینت لوگوں کی غلامی اور جلاں رہتی ہے۔ ہم اپنے وطن کو آزاد کرالیں گے کیونکہ ہم سب امیر اور غریب، افسر اور ماتحت ایک ہو گئے ہیں۔

میرا باپ حریت پسندوں کی مدد اس طرح کرتا تھا کہ انہیں اسلحہ بٹوے اور دوسرے جنگی ساز و سامان کی گاڑیوں کے متعلق اطلاعات دیا کرتا اور انہیں فوجی راز بھی بتایا کرتا تھا۔ چھاپہ مار جاہدین کے ساتھ اُس کا درپردہ رابطہ تھا۔ ماں نے مجھے بتایا کہ فرانسیسیوں کی خفیہ پولیس کو اُس پر شک ہو گیا اور ایک روز وہ پکڑا گیا۔

چھ مہینوں بعد، ایک رات باپ گھر آیا اور اُس نے مجھے جگایا۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ اُس نے کہا ”میرے عزیز بیٹے! مجھے بھول جانا، میری باتیں نہ بھولنا۔ ہم شاید کبھی نہ مل سکیں۔ میں قید سے فرار ہوا ہوں۔ اب میں ادھر نہیں آسکوں گا۔ میں مرجاؤں یا زندہ رہوں، تمہیں اپنے وطن

کو آزاد کرانا ہے تمہیں ماں بتا دے گی کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ میری وصیت یاد رکھو۔ ذہن سے اتار دو کہ تم کسی افسر کے بیٹے ہو۔ میں نے تمہیں جو آسائشیں دنیا کی تھیں، انہیں بھی بھول جاؤ۔ تمہیں ریگستان میں کسی فرانسیسی کی گولی سے یا پیاس سے مرنا ہے لیکن مرنا کوئی بہادری نہیں۔ مار کر مرنے کو بہادری کہتے ہیں.... میں ڈک نہیں سکتا۔ پولیس میرا پیچھا کر رہی ہے۔“ مجھے یاد ہے کہ باپ نے مجھے جھجھوٹا تھا اور کہا تھا ”جاگ میرے بیٹے، جاگ۔ جس قوم کے انجان سو جاتے ہیں اُس قوم کی قسمت سو جاتی ہے“

صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے ماں سے کہا کہ میں نے خواب میں ابا کو دیکھا ہے۔ ماں کو میں نے ابا کی باتیں سنائیں تو ماں نے مسکرا کر کہا کہ وہ آئے تھے، اور وہ جو باتیں کہہ گئے ہیں وہ بھول نہ جانا۔ پھر ماں نے مجھے بتایا کہ میرے باپ کو ایک جیل سے دوسری جیل میں لے جا رہے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ قیدیوں کو رات کو ادھر ادھر لے جایا کرتے تھے تاکہ حریت پسندوں کو پتہ نہ چل سکے لیکن اب کے حریت پسندوں کو پتہ چل گیا۔ انہوں نے دیرانے میں قیدیوں کی گاڑی چسلا کر دیا۔ چند ایک قیدی مارے گئے۔ اُن کے گاڑیوں سے بھی کچھ اور شاید تین چار چھاپہ مار بھی مارے گئے تھے۔ میرا باپ آزاد ہو کر نکل آیا اور مجھے وصیت کر کے چلا گیا۔



میری ماں کے چہرے پر اور اُس کی باتوں میں افسوس اور غم کا اشارہ بھی نہیں ملتا تھا۔ اُس نے مجھے وہ ساری باتیں یاد دلائیں جو باپ رات کو مجھے کہہ گیا تھا۔

”تمہیں بھی اپنے باپ کے پیچھے جانا ہے۔“ ماں نے کہا۔ ”وہ حریت اور شہادت کے راستے پر اپنے نشان چھوڑ گیا ہے۔ یہ نشان تہادی راہنمائی کریں گے۔ جہاں قدموں کے یہ نشان ختم ہو جائیں گے وہاں سے خون کے قطرے نہ ورع ہوں گے۔ یہ تمہارے باپ کا خون ہوگا۔ قوموں کے بیٹوں کی راہنمائی باپوں کے خون کے قطرے کیا کرتے ہیں۔“

الجزائر پر فرانسیسی میرے پیدا ہونے سے پہلے کے قابض تھے۔ اُس وقت وہ بیرونیال کہاں تھیں جو وطن کی آزادی پر اپنے خاندانوں، اپنے سہاگ کو قربان کر دیا کرتی ہیں اور اپنے بچوں کو قربان کرنے والی مائیں کہاں تھیں؟ وہ یہیں تھیں۔ وہ جس مذہب کی بیٹیاں ہیں اس کی روایت کو وہ فراموش کیے بیٹھی تھیں۔ مرد اپنے غیر ملکی بادشاہوں کے رنگ میں رنگے گئے تھے۔ غیر ملکیوں نے یہاں اپنے سکول کھول دیئے تھے جہاں وہ اسلام پر اپنے مذہب کا رنگ چڑھاتے چلے آ رہے ہیں۔ آخر باپوں کے سینوں میں ایمان کی ٹٹاقتی ہوئی شمع جل اٹھی۔ بیٹے بیدار ہو گئے۔ ماؤں نے اپنے بچے وطن کی قربان گاہ پر پیش کر دیئے۔ بیویوں نے اپنے سہاگ قوم کے قدموں میں رکھ دیئے۔

اس سے اگلی رات کا واقعہ ہے۔ ماں مجھے میرے باپ کی باتیں سنا رہی تھی کہ باہر کسی نے گاڑی کو برکیں لگائیں۔ ماں کے چہرے پر میں نے گھبراہٹ دیکھی۔ اُس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہ آگئے ہیں۔“

”کون؟“ میں نے خوشی سے پوچھا۔ ”آبا؟“

”نہیں.... پولیس.... شاید فوجی ہوں گے۔“

ہمارا دروازہ کھٹکھٹا نہیں، توڑا جا رہا تھا۔ فرانسیسی زبان میں جو ہم سمجھتے تھے، کسی نے چلا کر کہا۔ ”دروازہ کھول دو، ورنہ ہم اندر آئیں۔“

”کے گولے پھینکیں گے۔“

ماں غصے سے اٹھی اور بڑے دروازے کی طرف بڑھی۔ میں اُس کے پیچھے گیا۔ ماں نے دروازہ کھولا تو پولیس کے چار آدمی دوڑتے ہوئے اندر آئے اور کمروں میں داخل ہو گئے۔ وہ ہمارے گھر کی تلاشی لے رہے تھے۔ برتنوں اور فرنیچر کو ٹھٹھا اور رافلوں کے بٹ مار رہے تھے۔ ہمارے گھر کے چھ کمرے ہیں۔ انہوں نے ہر ایک کمرے میں جاکر سامان تہہ و بالا کو دیا پھینک دیا اور جب انہیں کچھ نہ ملا تو نیچے آکر مجھے اور میری ماں کو کھڑا کر لیا۔ میرا خون اُبل رہا تھا۔ میں فرانسیسیوں کو اپنا دشمن تو سمجھتا تھا، لیکن اُس روز مجھے پتہ چلا کہ اس دشمن نے ہماری ذاتی عزت اور ہمارے قومی وقار پر پاؤں رکھا ہوا ہے اور ہم جو ایک بڑے اور عظیم مذہب اسلام کے پیروکار ہیں، ان کفار کے سامنے ذلیل و خوار مخلوق ہیں۔

”وہ کہاں ہے؟“ ایک سارجنٹ نے میری ماں سے گرج کر پوچھا۔

”کون؟“

”تمہارا خاوند۔“ سارجنٹ نے کہا۔ ”وہ یہاں آیا تھا۔“

”وہ چھ مہینوں سے لاپتہ ہے۔“ میری ماں نے جواب دیا۔

”مجھے کچھ پتہ نہیں کہاں ہے۔“

اتنے میں ہمارا ایک پڑوسی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ اندر آ گیا۔ اُس کی یہ بیٹی میری ہم عمر ہے۔ اُس وقت ہم دونوں پندرہ سولہ سال کے تھے۔ اُس کا نام مارکونی ہے۔ یہ لوگ اٹلی کے رہنے والے ہیں۔ مارکونی میرے ساتھ چوتھے سٹینڈرڈ تک پڑھتی رہی ہے۔ ہمارے ساتھ اُس کا بڑا لگاؤ تھا۔ اٹلی اور یورپ کے بچے بھی ہمارے ساتھ پڑھا کرتے تھے لیکن مارکونی میرے ساتھ بیٹھتی، کھیتی بھی میرے ساتھ اور ہم دونوں کرائے کی ایک ہی گھوٹا گاڑی پر سکول جایا اور آیا کرتے تھے۔

مارکونی کا باپ محکمہ خوراک میں افسر تھا اور میرے باپ کا دوست۔

مارکونی کی ماں میری ماں کی سہیلی تھی۔ وہ بھی اور ہم بھی آپس میں فرانسیسی زبان میں باتیں کیا کرتے تھے۔

”آپ لوگ کیا لینے آئے ہیں؟“ سارجنٹ نے مارکونی کے باپ سے کہا۔ وہ اُسے یورپی باشندہ سمجھ کر شرافت سے بولا تھا۔

”میں اس خاتون (میری ماں) اور اس کے اس بچے کی ضمانت دینے آیا ہوں۔“ مارکونی کے باپ نے کہا۔ ”اس عورت کا خاوند مجرم اور باغی ہو سکتا ہے، اس عورت کو ہم پندرہ سولہ سال سے جانتے ہیں۔ یہ تو خاندان کی ستانی ہوئی مظلوم عورت ہے۔ اس سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تو بدھو عورت ہے۔“

اُس نے جھوٹ بولا تھا۔ میری ماں میرے باپ کی ستانی ہوئی ہرگز نہیں تھی، اور میری ماں بدھو عورت بھی نہیں تھی۔ یہ اطالوی مجھے اور میری ماں کو ان فرانسیسی درندوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری ماں فوراً بدھو بن گئی۔

”آپ یورپی ہیں اس لیے میں آپ کی ضمانت قبول کر سکتا ہوں۔“ سارجنٹ نے کہا۔ ”اگر آپ مسلمان ہوتے تو میں ان دونوں کے ساتھ آپ کو بھی گرفتار کر کے لے جاتا۔“ سارجنٹ نے بڑی نفرت سے انگلی میری طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سانپ کا بچہ ہے۔ اس عمر کے لڑکوں نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ قیدیوں کی گاڑی کو روکنے اور اس پر حملہ کر کے چھڑانے والوں میں سے پانچ مارے گئے تھے۔ وہ پانچوں سولہ سے اٹھارہ سال عمر کے لڑکے تھے۔ میں نے اُن کی لاشیں دیکھی ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے ان بد بخت اور مجرم مسلمانوں کے لڑکوں کو ختم کرنا پڑے گا۔“

میری ماں نے لپک کر مجھے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اپنے ساتھ لگا کر بدھو اور مظلوم ماں کی طرح گڑ گڑا کر کہا۔ ”میرا بچہ ایسا نہیں۔ یہ اپنے باپ پر نہیں جانے گا۔ میں خوش ہوں کہ اس کا باپ نہیں چلا گیا ہے۔“

”وہ میرا کلاس فیلو رہا ہے۔“ مارکونی نے سارجنٹ سے کہا اور

میری طرف گہری نظروں سے دیکھا جیسے کہ وہی ہو کر چپ رہنا اور مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔

میں نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹنا شروع کر دیا۔ ان فرانسیسیوں کا سلوک ہمارے ساتھ ایسا تھا جیسے وہ ہمیں ہمارے گھر سے نکال دیں گے۔ میں نے سارجنٹ کو دیکھا۔ وہ پچیس سال سے کچھ زیادہ عمر کا خوب رو آدمی تھا اور وہ مسکراتے ہوئے مارکونی کو دیکھ رہا تھا۔ مارکونی خوبصورت لڑکی تھی۔ سولہ سال کی عمر میں وہ زیادہ جوان دکھائی دیتی تھی کیونکہ اُس کا قد لمبا تھا۔ وہ سارجنٹ کو دیکھ رہی تھی جیسی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اُسے دیکھ رہا تھا۔

مارکونی کی سفارش کام کر گئی۔ سارجنٹ مجھے اور میری ماں کو دھکیلا دے کر مارکونی کے باپ کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میں نے باہر جا کر دیکھا۔ سارجنٹ مارکونی کے گھر چلا گیا تھا اور اُس کے سپاہی باہر گاڑی میں بیٹھے رہے۔ ان یورپیوں میں ہماری طرح شرم نہیں ہوتی۔ کوئی جاب نہیں ہوتا، لیکن میں نے اس کے متعلق کچھ بھی نہ سوچا۔ میں جانتا تھا کہ سارجنٹ نے مارکونی کی سفارش کیوں قبول کر لی تھی اور وہ اُن کے گھر کیوں چلا گیا تھا۔ مجھے ایسا افسوس بالکل نہ ہوا کہ مارکونی کا تو میرے ساتھ لگاؤ تھا اور اب وہ ایک سارجنٹ کو اپنے گھر لے گئی ہے۔ اُس وقت میرا دماغ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں اپنے باپ کے نقش قدم پر کس طرح چل سکوں گا؟ مجھے فرینک کون دے گا؟ مجھے کس سے ملنا چاہیے؟

ان سارے سوالوں کے جواب مجھے اپنی ماں سے مل گئے۔ اُس نے مجھے پہلا سبق یہ دیا کہ اگر اس طرح پولیس اچانک گھر میں آجائے تو فوراً بھگی بلی بن جاؤ۔ مسکین اور بھکاری بن جاؤ۔ پولیس والے گالیاں دیں تو جھبکا لو۔ احساس اور جذبات کو سینے میں دبا لو۔

”میں دیکھ رہی تھی کہ پولیس کے سامنے تمہارا چہرہ غصے سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔“ ماں نے کہا۔ ”اگر تم غصے کا ذرا سا بھی اظہار کر دیتے تو وہ

تمہیں پکڑ کر لے جاتے۔ قوم کا ایک نوجوان ضائع ہو جاتا۔ تمہیں اپنے باپ کی طرح زمین کے نیچے سے حملے کرنے ہیں۔ فرانسیسیوں کے قدم اکھڑ رہے ہیں۔ فتح ہماری ہوگی۔“

اُس روز کے بعد میں نے کئی بار سارجنٹ کو مارکونی کے گھر آتے دیکھا لیکن مجھ پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ یہ تو مجھے خود ہی معلوم ہو گیا ہے کہ الجزائر کے نوجوان اگر عورت کے چکر میں پڑ جائیں تو غلامی کا شکنجہ اور زیادہ سخت ہو جائے گا۔ میں نے سولہ سال کی عمر میں سمجھ لیا تھا کہ ہمارے فرانسیسی حکمران ہمیں ذہنی عیاشی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ میں مارکونی کو انہی نظروں سے دیکھتا رہا جن سے پہلے دیکھا کرتا تھا۔

میری ماں نے میری ٹریننگ کا انتظام کر دیا۔ تین ماہ بعد، ایک روز مارکونی ہمارے گھر آئی اور مجھ سے رازداری سے پوچھا۔ ”تمہارے گھر میں کوئی ایسی ویسی چیز تو نہیں؟۔۔۔ میرا مطلب ہے کوئی اسلحہ یا ایمونیشن وغیرہ؟“

”میرے گھر میں اسلحہ اور ایمونیشن کہاں سے آسکتا ہے؟“

میں نے قدرے غصے سے کہا۔

”شش!“ مارکونی نے کہا۔ ”مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، اس میں تمہارا فائدہ ہے اور اس میں تمہاری ماں کی عزت ہے۔ میں جانتی ہوں تم کیا کر رہے ہو۔“

”معلوم ہوتا ہے فرانسیسی سارجنٹ نے تمہاری فطرت ہی بدل ڈالی ہے۔“ میں نے طنز یہ کہا۔ ”تم نے خبری شروع کر دی ہے۔“

”شش!“ اُس نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا۔ ”میں واقعی خبری کر رہی ہوں۔ میں تمہیں راز کی یہ بات بتانے آئی ہوں کہ آج رات تمہارے گھر پر پولیس کا چھاپہ پڑے گا۔ اگر گھر میں کوئی قابل اعتراض چیز ہے تو اسے زمین میں دبا دو یا مجھے دے دو یا کہیں اور غائب کر دو۔“

وہ چلی گئی۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ مارکونی پر مجھے بھروسہ کرنا چاہیے یا

نہیں۔ میں نے ماں کو بتایا۔ اُس نے کہا کہ کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا۔ یورپ کے کسی باشندے پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ مارکونی بھید لینے آئی تھی کہ ہمارے گھر میں اسلحہ ہے یا نہیں۔

میرے گھر میں دو خنجر تھے جو فرانسیسی حکومت کے حکم کے مطابق رکھنا جرم تھا۔ اس کے علاوہ ایک ۳۲ بور کا پستول تھا جس کی میگزین میں گیارہ گولیاں پڑتی ہیں۔ یہ پستول ہمارے گھر میں دس بارہ دن پہلے آیا تھا۔ ایک آدمی لایا تھا جسے میری ماں جانتی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ یہ میرے باپ نے

میرے لیے بھیجا ہے۔ باپ کی زندگی اب رگستان میں گذر رہی تھی۔

جس روز مارکونی نے مجھے آکر خبردار کیا تھا، اُسی شام ایک غلیظ سے بھکاری نے ہمارے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو

وہ اندر آ گیا۔ اُس کی داڑھی لمبی اور گندی تھی۔ سر کے بال بھی بہت گندے تھے۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور بدبودار۔ میں نے اُسے اندر آنے سے روکا لیکن وہ اندر کمرے میں آ گیا اور ہنس کر بولا۔ ”اگر بیٹے نے مجھے نہیں پہچانا تو فرانسیسی پولیس تو مجھے پہچان ہی نہیں سکے گی۔ میرا بہروپ کامیاب رہا۔“

”آپ کو یہاں نہیں رکنا چاہیے۔“ میں نے باپ سے کہا اور انہیں بتایا کہ مارکونی کی دوستی ایک فرانسیسی سارجنٹ سے ہو گئی ہے اور وہ بتا گئی ہے کہ آج رات ہمارے گھر چھاپہ پڑے گا۔

باپ نے ماں کو کچھ رقم دی اور کہا۔ ”اس لڑکی کا مطلب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، مجھے یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ میں کچھ بھی آؤں گا۔ گھر میں اگر کوئی ہتھیار ہے تو وہ کہیں چھپا دو۔“

باپ چلا گیا۔ اس سے ایک ہی گھنٹہ بعد ہمارا دروازہ کسی کی دستک سے ٹوٹنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی چھت کپڑے کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔

میری ماں نے دروازہ کھولا۔ پولیس کے تین چار آدمی ٹاپیں روشن کیے اندر آ گئے۔ دو چھت سے اُترے اور انہوں نے ہمارے گھر کی تلاشی یعنی شروع کر دی میں خنجر اور پستول پردوں کی کیاری میں دبا چکا تھا۔ پولیس نے ہمارے گھر

اور مار کوئی کی شادی اس سارجنٹ کے ساتھ ہو گئی۔ اُس وقت تک میں چوری چھپے تھوڑی سی فوجی تربیت حاصل کر چکا تھا۔ مار کوئی اپنے خاندان کے ساتھ چلی گئی۔

ایک رات میرا باپ اُسی بھروپ میں آیا جس میں وہ پہلے آچکا تھا۔ اُس نے میری ماں سے کہا۔ ”میں تمہارے بچے کو لے جا رہا ہوں۔ اسے خدا حافظ کہو۔ کبھی کبھی میری طرح آجایا کرے گا۔“

ماں کے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے مجھے گلے لگایا، میرا سر اور میرے گال جوڑے اور زندگی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اگر تم صرف میرے بیٹے ہوتے تو تمہیں کبھی نہ جانے دیتی مگر تم قوم کے بیٹے ہو۔ مسلمان مائیں اپنے بیٹوں کو اپنی ملکیت نہیں سمجھ سکتیں۔ ان کے بیٹے خدا کی امانت ہیں... جا بیٹا! میں تمہیں خدا کے حوالے کرتی ہوں۔“

گوشش کے باوجود میں اپنے آنسو نہ روک سکا۔ میرے باپ نے میری ماں سے کہا۔ ”پولیس آئے اور اس کا پوچھے تو رو پڑنا اور کہنا کہ میرا بیٹا گھر سے بھاگ گیا ہے۔“

میں باپ کے ساتھ چلا گیا۔ شہر سے چھپ چھپ کر نکلے۔ شہر سے کوئی ایک میل دور اندھیرے میں ایک آدمی دو اونٹوں کے پاس کھڑا تھا۔ وہ میرے باپ کا ساتھی تھا۔ ایک اونٹ پر باپ نے مجھے اپنے ساتھ سوار کر لیا اور دوسرے پر وہ آدمی سوار ہو گیا، پھر ہم اُس منزل کو روانہ ہو گئے جہاں میں آج ہوں

آدھی رات کے بعد ہم ایسے علاقے میں پہنچے جہاں مٹی اندریت کے اونچے اونچے ٹیلے تھے بعض ٹیلے ستونوں کی طرح، بعض دیواروں کی طرح کھڑے تھے بعض ایسی شکلوں کے تھے جیسے کسی قدیم عمارت کے کھنڈر ہوں۔ اونٹ ان میں گھومتے اور موڑ مڑتے ہوئے ایک جگہ ٹوک گئے جہاں دو لائٹس روشن تھیں اور بہت سارے آدمی گپ شپ لگا رہے تھے۔ میرے تعارف کے بعد ایک آدمی نے میرے ہاتھوں پر قرآن رکھا

کے سامان کا یہ حال کر دیا جیسے ڈاکہ پڑا ہو۔ اس پارٹی کے ساتھ ایک اور سارجنٹ تھا۔ اُس نے مجھے اور میری ماں کو اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ ”تم نے سکول جانا کیوں چھوڑ دیا ہے؟“ سارجنٹ نے مجھ سے پوچھا۔

”اسے میں نے سکول سے ہٹا دیا ہے۔“ میری ماں نے جواب دیا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ اس کا باپ جیل خانے میں پڑا ہے۔ میں اسے کیسے پڑھا سکتی ہوں۔ دوسرا ڈیرہ ہے کہ باہر کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا اکلوتا بیٹا حالات کا شکار ہو جائے۔“

”تمہارا خاندان قید سے فرار ہو چکا ہے۔“ سارجنٹ نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”تم اچھی طرح جانتی ہو وہ کہاں ہے اور یہ لڑکا باغیوں کے پاس جاتا ہے۔ اگر اپنے خاندان کا سراغ دے دو تو آرام سے زندگی بسر کر سکو گی۔ اس کے علاوہ اپنے اس بیٹے پر نظر رکھو۔ اگر یہ پکڑا گیا تو تمہیں ساری عمر نہیں ملے گا۔“

وہ فرعونوں کی سی حرکتیں اور باتیں کر کے چلے گئے۔ ماں بہت دیر تک کھٹے ہوئے دروازے کو دیکھتی رہی۔ میں نے اُس کی سرگوشی سنی۔ ”میں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے وطن پر قربان کر دیا ہے۔“ کچھ دیر بعد مار کوئی آگئی اور بولی۔ ”اب تو مجھ پر اعتبار کرو گے شمس! میں فرانسسی نہیں، اطالوی ہوں۔“

”پھر وہ سارجنٹ تمہارے گھر کیوں آتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم اُس کے ساتھ باہر کیوں جاتی ہو؟“

”میں اس کے ساتھ شادی کر رہی ہوں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میرے ماں باپ نے مجھے اجازت دے دی ہے... لیکن میں نہیں دھو کہ ننیر ڈول گی تم میرے بچپن۔ کہ ساتھی ہو تم میری شادی ایک فرانسیسی سارجنٹ کے ساتھ ہو رہی ہے، فرانس کی حکومت کے ساتھ نہیں ہو رہی۔“



اور یہ حلف لیا۔ ”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ اپنے وطن  
الجزائر کی آزادی کی خاطر کسی قربانی سے منہ نہیں موڑوں گا۔ خواہ یہ قربانی میری  
جان کی ہو۔۔۔۔۔ اور میں قرآن مقدس کی قسم کھاتا ہوں کہ کوئی راز فاش نہیں  
کروں گا۔ قید کی صورت میں بہادری اور تشدد برداشت کروں گا۔  
اپنے کسی ساتھی کی نشاندہی نہیں کروں گا۔“

اس حلف نے مجھے عمر سے زیادہ جوان کر دیا اور ایسے لگا جیسے میں وہ  
نہیں ہوں جو ایک افسر کا بیٹا تھا اور جس نے فرانسیسی سکول میں تعلیم حاصل  
کی تھی۔ دو تین روز بعد مجھے دشمن کے ٹرکوں پر حملے کرنے کی ٹریننگ اس  
طرح دی جانے لگی جس طرح شیرنی اپنے بچوں کو شکار کی ٹریننگ دیا کرتی ہے۔  
فرانسیسیوں نے گستان میں کہیں کہیں چوکیاں بنا رکھی ہیں جو مٹی کی دیواروں  
کے چھوٹے چھوٹے طے ہیں۔ ہم ان پر فائرنگ کیا کرتے ہیں۔ انہیں راشن  
وغیرہ پہنچانے کے لیے ٹرک جایا کرتے ہیں۔ ہم ان ٹرکوں کو روکنے کی کوشش  
کیا کرتے ہیں۔

میں کئی شیون مار چکا ہوں۔ تین بار بھکاریوں کے بھیس میں ماں سے مل  
آیا ہوں۔ شہر، قصبوں اور دیہات میں ہمارے گھر ہیں۔ وہاں ہمارے  
عزیز رشتہ دار رہتے ہیں مگر ہم میں سے جو مارے جاتے ہیں انہیں ہم رگستان  
میں دفن کر دیتے ہیں۔ ان کی لاشیں ہم ان کے گھروں تک نہیں پہنچا سکتے۔  
میں نے کئی سر کے ٹسے ہیں۔ ایک روز مجبوروں نے ”کر تبا“ کہ کچھ  
قیدی ایک جیل خانے سے کسی دوسری جگہ لے جائے جارہے ہیں۔ تین گاڑیاں  
بتائی گئی تھیں۔ ان کو روانگی کا وقت شام سے پہلے کا تھا۔ لیڈر نے ان گاڑیوں  
پر حملہ کرنے کے لیے مجھے بھی منتخب کیا۔ پتہ چلا کہ میرا باپ بھی اس پارٹی کے  
ساتھ جا رہا ہے اور اسی نے مجھے منتخب کرایا تھا۔ ہم کل پندرہ آدمی تھے۔  
جس سڑک پر گاڑیاں آرہی تھیں وہ ایک ایسی جگہ سے گزرتی ہے جہاں دوڑ  
طرف ریتی چٹائیں ہیں۔ اس علاقے کے ساتھ ہی دو گاؤں ہیں۔  
ہم وقت پر وہاں پہنچ گئے اور لیڈر نے ہمیں گھات میں بٹھا دیا گھات

کے لیے علامہ نہایت اچھا تھا۔ ٹیلوں کی اوٹ بہت اچھی تھی۔ درخت  
ایک بھی نہیں تھا۔ مجھے باپ نے ایسی جگہ پوزیشن میں بٹھایا جو سڑک کے  
قریب تھی۔ میرا کام یہ تھا کہ مجھے اگلی گاڑی کے ڈرائیور کو گولی مارنی تھی اور  
اگر گولی خطا جائے تو گاڑی کے ٹائروں پر فائر کرنا تھا۔ میرے پاس راسخ  
تھی۔ میرے دوسرے ساتھیوں کو بھی ہدایات دے دی گئی تھیں۔

صحرا کی یہ سڑک ٹیلوں کے اوپر سے دور تک نظر آتی تھی پندرہ بیس  
منٹ بعد ہمیں دُور کی گونج سنائی دی جو تیزی سے بڑھی آئی اور یہ ہوائی جہاز  
کی آواز بن گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت کا ایک لڑاکا بمبار ہوائی جہاز  
بڑی کم بلندی پر آ رہا تھا۔ ہمیں اپنے لیڈر کی للکار سنائی دی۔ ”چھپ جاؤ۔“  
ہم سب جہاں تھے وہیں چھپ گئے۔ ہوائی جہاز اتنی کم بلندی سے  
ہمارے اوپر سے گذرا کہ ہم اسے راتوں کی گولیوں سے گرا سکتے تھے۔ وہ  
آگے جا کر واپس آگیا اور ہمارے اوپر دو تین چکر کاٹ کر جبر سے آیا تھا اور  
ہی چلا گیا۔ یہ ہمارے لیے خطرہ تھا۔ یہ قیدیوں کی گاڑیوں کی حفاظت کے  
لیے آیا تھا۔ ہماری حرکت پر یہ ہمیں دیکھ سکتا تھا۔ مجاہدین نے فوجی کنواہوں  
پر اتنے زیادہ حملے شروع کر دیئے تھے کہ اب فرانسیسی حکومت نے کنواہوں  
کی حفاظت کے لیے ہوائی جہاز استعمال کرنے شروع کر دیئے تھے۔

ہمارے پاس طیارہ شکن گنیں نہیں تھیں۔ ہوائی جہازوں کے مقابلے  
میں ہم ختم ہوتے تھے لیکن ہمیں بے تیغ لڑنا تھا۔ ہمارے لیڈر ہمیں کہا کرتے  
ہیں کہ مسلمان جذبہ ایمانی سے لڑا کرتا ہے اور یہ کفر اور اسلام کی لڑائی ہے۔  
میں جس جگہ تھا وہاں سے مجھے تقریباً ایک میل دور تک سڑک نظر آتی تھی۔  
میں اُدھر دیکھ رہا تھا کہ مجھے قیدیوں کے قافلے کی پہلی گاڑی نظر آئی ٹیلوں  
یعنی ہماری گھات میں سے مجھے اپنے باپ کی للکار سنائی دی۔ وہ اوپر  
تھا۔ اُس نے بلند آواز سے کہا۔ ”خبردار۔۔۔۔۔ گاڑیاں زیادہ ہیں۔“  
گاڑیاں زیادہ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ گارڈ کی نفری زیادہ ہے۔  
قیدیوں کی گاڑیوں کو ہم سب پہنچانتے ہیں۔ یہ پنجرے بنی ہوئی ہوتی ہیں۔

ان پر غائر کرتے ہمیں احتیاط کرنی پڑتی ہے کہ کوئی قیدی نہ مارا جائے۔  
الجزائر میں اخلاقی قیدیوں کی بہت کمی ہے۔ سب "بغاوت کے جرم"  
میں پکڑے ہوئے ہیں۔ مسلمان اب کوئی جرم نہیں کرتے۔ جیل خانوں میں  
جو اخلاقی قیدی ہیں وہ یورپی باشندے ہوں گے۔ یہ قیدی جو ہمارے سامنے  
سے گزرنے والے تھے، مجاہدین تھے جن میں بعض گھروں سے پکڑے گئے تھے  
اور بعض مختلف معرکوں اور چھاپوں میں گرفتار ہوئے تھے۔ ہم انہیں رہا کرنے  
آئے تھے۔

اپنے لیڈر کی نکار سنائی دی۔ "خبردار.... اور ہوائی جہاز ہے۔"  
اب ہوائی جہاز تھا، انہیں گاڑیاں کم و بیش ساٹھ میل فی گھنٹہ کی  
رفتار سے ہمارے قریب آگئی تھیں۔ پہلے ہوائی جہاز ہمارے اوپر  
سے گزر گیا۔ میں نے اگلی گاڑی کے ڈرائیور کو شست میں لینا شروع  
کر دیا۔ گاڑی جب ایک سو گز تک آگئی تو میں نے ٹرگر دبا دیا۔ مجھے  
گاڑی کی سکین ٹوٹی نظر آئی۔ گاڑی سیدھی گزرتی گئی۔ میں نے دونوں ٹائر  
پر بڑی تیزی سے دو گولیاں فائر کیں۔ اس کے ساتھ ہی میری باقی پارٹی  
نے فائرنگ شروع کر دی۔

اگلی گاڑی اچانک دائیں کو گھومی اور الٹ گئی۔ میرا خیال ہے میری  
گولی ڈرائیور کو لگی تھی۔ اس گاڑی نے سڑک بند کر دی۔ قیدیوں کی گاڑیاں  
صرف دو تھیں۔ باقی چار گاڑیاں گارد کی تھیں۔ گارد کی نفری اسی تو ہے تھی۔  
اس کے پاس مشین گنیں تھیں۔ ہم صرف پندرہ تھے۔ اگلی گاڑی گارد کی تھی۔

یہ پولیس کی گارد تھی۔ وہ تو بیکار ہو چکی تھی کیونکہ گاڑی الٹ گئی تھی۔ اوپر  
ہماری مشین گنوں کے فائر نے اس میں سے ایک بھی آدمی کو نہ اٹھنے دیا۔

دوسری گاڑیوں کی گارد نے مقابلہ شروع کر دیا۔ پوزیشن تو ہماری  
اچھی تھی مگر اوپر سے ہوائی جہاز آگیا۔ گارد کے پاس شاید وائریس سٹیت  
تھا۔ اس سے ہوائی جہاز کے پائلٹ کو اطلاع دی گئی ہوگی۔ ہوائی جہاز غوطے  
میں آیا اور اس کی مشین گنوں نے گولیوں کا مینہ برسادیا۔ ہماری تو تہہ نیچے

پولیس گارد پر تھی۔ اُس کا بہت نقصان ہو چکا تھا مگر ہوائی جہاز کی بار بار فائرنگ  
سے ہماری پوزیشن کمزور ہو گئی۔ ہوائی جہاز آتا تھا تو ہم دبک جاتے تھے۔  
اس دوران پولیس کی نفری اچھی پوزیشن میں ہو جاتی تھی۔ بہت سے سپاہی  
ٹیلوں کے اندر آ گئے۔

میں نے اپنی پوزیشن بدل لی اور کچھ اوپر چلا گیا۔ دو ٹیلوں کے درمیان  
مجھے دوفرانسیسی نظر آئے۔ میں انہیں نظر نہیں آ سکتا تھا۔ سورج غروب  
ہو رہا تھا۔ میں نے ان دونوں میں سے ایک کو پہچان لیا۔ وہ سارجنٹ  
تھا اور وہ مارکونی کا خاوند تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ٹپن گن تھی۔ وہ ٹیلے  
کے ساتھ لگا نہایت آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ میں نے اُسے رائفل کی  
شست میں لے لیا۔

"میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گی۔" مجھے مارکونی کی آواز سنائی  
دی۔ "تم حق پر ہو۔ میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گی۔"

میری انگلی رائفل کے ٹرگر سے ہٹ گئی۔ مارکونی نے مجھے دھوکہ  
نہیں دیا تھا۔ اگر وہ مجھے اُس رات خبردار نہ کر دیتی کہ میرے گھر پر پولیس  
کا چھاپہ پڑے گا تو میرا باپ پکڑا جاتا اور میرے گھر سے ایک اسپتال اور دو خنجر  
برآمد ہوتے اور میں بھی باپ کے ساتھ جیل خانے میں اذیتیں سہہ رہا ہوتا۔  
میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ میں مارکونی کو بیوہ کر دوں یا اُس  
کے احسان کا صلہ دوں۔ مجھے اچانک اپنی قوم کی بیواؤں یاد آئیں جن کے  
خاوندوں کو فرانسیسیوں نے شہید اور قید کیا تھا۔ الجزائر کی ہر بیوی بیوہ ہونے  
کی منتظر رہتی تھی۔

میری انگلی ٹرگر پر چلی گئی اور میں نے اللہ سے بخش مانگ کر انگلی دبا  
دی۔ مارکونی کا خاوند سیدھا ہو گیا پھر ایک سپلو پر گرا۔ میں نے دوسری گولی  
چلائی اور سارجنٹ کا ساتھ بھی ڈھیر ہو گیا۔

ہم قیدیوں کو آزاد نہ کرا سکے۔ اُن کی گاڑیاں نکل گئی تھیں۔ ہوائی جہاز  
چلا گیا تھا مگر پھر آگیا۔ شاید یہ دوسرا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شام کی تاریکی نے

ماں جو شہزادی تھی، افسر کی بیوی جسے گھر میں امیرانہ آسائشیں حاصل تھیں، اب چھوٹے سے ایک صحرائی گاؤں میں دو بکریاں پال رہی ہے۔ روکھی لکھی کھاتی ہے۔ میں اور بھی میرا باپ اُسے دیکھنے جاتے ہیں تو وہ سُکراتی ہوئی مٹی ہے، اور کہا کرتی ہے ”الجزائر آزاد ہو کے رہے گا۔ ریگستان کی ریت شہیدوں کے خون سے تر ہو چکی ہے۔ آزادی کی کونسل پھوٹے گی۔“



ہیں چھپایا۔ ہوائی جہاز چلا گیا۔ میرے پندرہ ساتھیوں میں سے آٹھ شہر ہو چکے تھے۔ میرا باپ زخمی تھا۔ رات کو ہم لاشیں اٹھائے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ پولیس کا کچھ اسلحہ ہمارے ہاتھ لگا۔

سات آٹھ روز بعد میں بھکاریوں کے گھیس میں اپنی ماں کو دیکھ گیا۔ اُس نے بتایا کہ مارکونی کا خاندان مارا گیا ہے اور وہ بہت غمگین ہے میں نے ماں کو نہ بتایا کہ مارکونی میرے ہاتھوں بیوہ ہوئی ہے۔ ماں نے میں نے کہا کہ وہ کسی بہانے مارکونی کو یہاں لے آئے۔

معلوم نہیں کس بہانے ماں مارکونی کو اپنے ساتھ لے آئی۔ میں اُلگ کمرے میں لے گیا۔ وہ بہت غمگین تھی۔ اُس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ ”مارکونی!“ میں نے اُسے کہا۔ ”میں نے اپنا قومی فرض ادا کرے جس سے تم بیوہ ہو گئی ہو۔ تمہارا سہاگ میری گولی کا نشانہ بنا ہے۔ تمہارا خاؤ میرے سامنے آگیا تھا۔۔۔ میں قوم کا فرض پورا کر چکا ہوں۔ اب میں ذاتی فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں نے اپنے کپڑوں کے اندر چھپایا ہوا پستول نکالا۔ پستول مارکونی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو، اور اپنے خاندان کے خون کا بدلہ لے لو۔ میں نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے۔ میں تمہارے احسان کا صلہ نہیں دے سکا۔ اپنی جان دے سکتا ہوں۔ یہ لو پستول، میری جان لے لو۔ ایک بات کہوں گا میری ماں سے انتقام نہ لینا۔“

اُس نے پستول میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اسے دیکھا، پھر مجھے دیکھا اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے پستول مجھے دے دیا۔

”چلے جاؤ شمس! یہاں سے چلے جاؤ۔“ اُس نے روتے ہوئے کہا۔ اُسے اچانک غصہ آگیا۔ دانت پیس کر بولی۔ ”اپنی ماں کو یہاں سے لے جاؤ۔ اُسے تمہیں غائب کر دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اُسی سے انتقام لے لوں۔ اُسے لے جاؤ، ورنہ میری رپورٹ پر کڑی جائے گی۔“

وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

اب میری ماں ایسی جگہ ہے جہاں اُسے کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔ وہ

## تیسرا آدمی

# PDF

الجزائر کی جنگ آزادی کی کمانی مسلمانوں کے جذبہ حریت اور جذبہ ایشار کی ایسی مثال ہے جو صرف مسلمان ہی پیش کر سکتے ہیں۔ الجزائر کے اسلام کے شیدائیوں نے جس طرح اپنے وطن کو فرانسیسی استبداد سے آزاد کرایا ہے وہ اس لحاظ سے دوسری قوموں کے لیے حیران کن ہے کہ حریت پسند فوج کی صورت میں منظم نہیں تھے اور ان کے پاس فرانسیسی فوج جیسے ہتھیار بھی نہیں تھے۔ ان کے لڑنے کے طریقے کو ”دہشت پسندی“ کہا جاتا ہے۔ صحیح الفاظ میں یہ گوریلا جنگ تھی۔ یہ کمانی اسی جہاد آزادی کا ایک سچا واقعہ ہے۔

محمود بن مصطفیٰ حریت پسندوں کے ایک سیکڑ کا کمانڈر تھا لیکن فرانسیسی پولیس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ حکومت کے خلاف لڑ رہا ہے۔ وہ دن کے وقت ایک امن پسند شہری کی طرح گھومتا پھرتا، گپ شپ لگاتا یا اپنے دفتر میں کام کرتا نظر آتا تھا۔ صرف اُس کے گردہ کو معلوم تھا کہ وہ آٹھ فرانسیسی افسروں کو دستی بموں سے اڑا چکا ہے اور تین چار

فوجی کنوایتوں پر بھی وہ حملے کر چکا ہے۔ محمود بہت دلیر حریت پسند تھا۔ اسی لیے اُسے ایک سیکڑ کا خفیہ کمانڈر بنادیا گیا تھا۔ اُس کے تعلق مشہور تھا کہ وہ قتل کے فن کا ماہر ہے۔ اسے ماہر قاتل فرانسیسیوں نے بنایا تھا جو اس کے ملک پر قابض تھے اور ہزاروں حریت پسندوں کو قتل کر چکے تھے۔



کچھ دنوں سے ایک الجزائر سی عیسائی جس کا نام چل تھا، اُسے کہا رہا تھا کہ وہ اُسے اپنے گروہ میں شامل کر لے کیونکہ وہ بھی فرانسیسی حکومت کے سخت خلاف تھا۔ وہ اپنے وطن کو مذہب پر ترجیح دے رہا تھا۔ محمود اُسے ٹال رہا تھا کیونکہ چل عیسائی تھا۔ محمود اُس کے سامنے اعتراف کر ہی نہیں رہا تھا کہ اُس کا وطن کی آزادی کے ساتھ کوئی تعلق ہے مگر چل کو یقین تھا کہ محمود جھوٹ بول رہا ہے۔

چل تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ اُس نے یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اُس کی ماں فرانسیسی تھی اور باپ الجزائر سی عیسائی۔ چل کی ماں کٹر فرانسیسی تھی۔ اُس نے اپنے خیالات کو اپنے خاوند اور بیٹے پر غالب کر رکھا تھا۔ چل کا باپ سرکاری ملازم تھا اور سرکار فرانسیسی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ الجزائر کے گنوار مسلمانوں کو آزادی ملنی چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو فرانسیسی حکومت کا نہایت اہم کل پڑھ سمجھا کرتا تھا۔

چل کا جب شعور بیدار ہوا تو اُس نے مسلمانوں کو اپنے گھر میں ملازم دیکھا تھا اور ماں نے اُسے بتایا تھا کہ ان مسلمانوں کا حق صرف اتنا ہے کہ انہیں برائے نام تنخواہ اور دو وقت روٹی کے عوض گھر میں نوکر رکھ لیا جائے۔ چل جب جوان ہوا تو اُس کے اندر ایک چنگاری سُکنے لگی۔ اس کے بعد یہ احساس بیدار ہو گیا کہ وہ الجزائر سی ہے اور فرانسیسیوں کا غلام۔

اس احساس کی بیداری کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ مسلمان لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ اُس نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ اپنی ماں اور اپنے باپ سے پوچھے کہ سمندر پار سے کوئی قوم آکر دوسری قوم کو کیوں محکوم بنالیتی ہے اور انسان کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان کو برائے نام تنخواہ اور دو وقت روٹی کے عوض ملازم رکھ لے مگر وہ اپنی ماں سے ڈرتا تھا۔ اُسے پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ایک روز ایک مسلمان نوجوان نے اُسے کہا ”تمہارا باپ غدار ہے جو الجزائر سی ہو کر فرانسیسیوں کا وفادار بنا ہوا ہے۔“

دوسرے نوجوان نے اُسے کہا ”تمہارا باپ فرانس کا نہیں تمہاری ماں کا غلام ہے۔“

اور جب چل کی عمر اٹھائیس سال ہوئی تو الجزائر سی مسلمان گوریلا طرز کی جنگ آزادی شروع کر چکے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کے مسلمان دوست اب سینہ تان کربات کرتے تھے۔ چل پر ان باتوں نے اور دوستوں کے طعنوں نے ایسا اثر کیا کہ وہ مسلمان حریت پسندوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا۔

ایک روز اُسے دو مسلمان دوستوں نے اُسے کہا ”تمہارا باپ بھی حریت پسندوں کے ہاتھوں قتل ہوگا۔“

چل کو اپنے باپ سے محبت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا باپ قتل ہو جائے اور قتل بھی ایسا بھیانک کہ گریڈ سے اُس کے جسم کے ٹکڑے بکھر جائیں۔ ایک شام اُس نے باپ کے ساتھ بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن باپ نے اپنے فرانسیسی حکومت کی مدد سرائی شروع کر دی پھر وہ الجزائر سی مسلمانوں کو کوسنے لگا۔ چل اُسے سمجھ نہ سکے گا پھر اُس نے اپنی اس کمزوری کو بھانپ لیا کہ وہ کسی سے سمجھ نہیں کہہ سکتا مگر وہ اپنی اس قوت کے آگے بھی بے بس تھا کہ اُس میں جذبہ آزادی پیدا ہو گیا تھا اور اُس نے مذہب کو ایک طرف رکھ کر وطن کو آزاد کرانے کا تہمتہ کر لیا تھا۔

اُسے ایک بار اپنے ہم مذہب دوستوں نے کہا تھا کہ یہ مسلمانوں کی جنگ ہے اس لیے چل اس سے کنارہ کش رہے۔ چل نے ایک ہی بار انہیں جواب دے کر ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا تھا۔

”وطن آزاد ہو تو انسان کا کوئی مذہب ہوتا ہے۔“ اُس نے جواب دیا تھا۔ ”وطن غلام ہے تو انسان مسلمان ہے نہ عیسائی۔ وطن اپنے باشندوں کو مذہبوں میں تقسیم نہیں کیا کرتا۔ میں جب تک فرانسیسیوں کا غلام ہوں، میں بے مذہب ہوں۔“

یہی بے چینی تھی جو اُسے محمود بن مصطفیٰ کے پاس لے گئی تھی مگر محمود اُسے جاسوس سمجھ رہا تھا۔ یہ چل کی بے تائیاں تھیں جن سے متاثر ہو کر محمود کو ماننا پڑا کہ محل حاسوس نہیں لیکن محل کو آزمانے کے لیے محمود نے اُسے بڑا ہی خطرناک مشن دیا۔ مشن یہ تھا کہ ایک فرانسیسی افسر کی کار میں گریڈ پھینکنا تھا۔ ایسے واقعات تو الجزائر میں ہوتے ہی رہتے تھے۔ فرانسیسی افسر حریت پسندوں کے ہاتھوں مرتے ہی رہتے تھے۔ بعض حریت پسند صاف پنج کر نکل جاتے اور جو کپڑے جاتے انہیں اڈوں کے جہنم میں پھینک دیا جاتا تھا۔

محمود نے اس فرانسیسی افسر کو قتل کرنے کا جو طریقہ اور موقع بتایا تھا، اس سے محل سوچ میں پڑ گیا تھا۔ سوچ یہ تھی کہ یہ فرانسیسی افسر محل کے باپ کا گہرا دوست تھا۔ وہ اسی افسر کے دفتر میں افسر تھا۔ منگل کی صبح کو وہ دونوں تالاب میں تیرکی کے لیے جایا کرتے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ محل کا باپ اپنے گھر سے تالاب پر چلا جاتا اور فرانسیسی افسر اپنے گھر سے پہنچ جاتا تھا۔ اُس کی کار تھی۔ کبھی کبھی وہ محل کے باپ کو کار میں بٹھا کر گھر چھوڑ جایا کرتا تھا۔ محل کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ اُس کا باپ بھی اُس کے ہاتھوں مارا جائے۔ محل کو اپنے باپ کے ساتھ اتنی زیادہ محبت تھی کہ سیاسی اختلافات کے باوجود یہ اُس کی برداشت سے باہر تھا کہ اُس کا باپ قتل ہو جائے۔

محمود اس فرانسیسی افسر کو ہر روز دیکھتا۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک اُس کا پیچھا کرتا تھا۔ وہ پورا ایک مہینہ اس افسر کے معمول کا جائزہ لیتا رہا۔ اُسے وہ ایسی جگہ قتل کرنا چاہتا تھا جہاں اُسے پکڑنے والا کوئی نہ ہو اور اُس کا وار خالی بھی نہ جائے۔ اُس نے آخر منگل کی صبح کو نہایت موزوں وقت قرار دیا۔ اتنی سویرے سڑکوں پر بہت کم لوگ ہوتے تھے اور جن تالاب پر وہ افسر جایا کرتا تھا وہ گمنان آبادی سے الگ تھلک تھا۔ وہاں یا راستے میں اُس کی کار کے اندر دستی بم کسی کو نظر

آئے بغیر پھینکا جاسکتا تھا۔

یہ کام محمود کو خود کرنا تھا۔ اُس نے ایک گریڈ اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اتنے میں محل اس کے پیچھے پڑ گیا کہ اُسے اپنے گروہ میں شامل کر لے محمود نے اُسے آزمانے کے لیے یہی مشن دے دیا اور اُسے بتایا کہ وہ منگل کی صبح فلاں جگہ اس افسر کی کار میں گریڈ پھینکے۔ محمود نے اُسے بتایا تھا کہ گریڈ سے جب پن نکال لو تو اسے سٹھی میں دبا کر رکھنا ورنہ یہ ہاتھ میں ہی پھٹ کر جہنم کے پرچھے اڑا دے گا۔

منگل کی صبح محل اُس جگہ کے قریب جہاں اُسے کار کے اندر گریڈ پھینکنا تھا ایک قہوہ خانے میں بیٹھا کار کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کے کوٹ کی جیب میں گریڈ تھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ اس جیب میں ڈال رکھا تھا اور اس ہاتھ کی انگلیاں گریڈ کے پن کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ وہ اپنے باپ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کو پتہ نہیں چلنے دیا تھا کہ وہ نیشنل لبریشن فرنٹ میں شامل ہو چکا ہے۔ اُسے افسوس سا ہو رہا تھا کہ وہ باپ کو دھوکہ دے رہا ہے لیکن اُسے یہ امید حاصل دے رہی تھی کہ الجزائر کے نوجوان مجاہدین جان اور خون کی قربانیاں دے کر وطن عزیز کو آزاد کرالیں گے تب محل کے باپ کو پتہ چلے گا کہ اُس کا بیٹا بھی آزادی کی جنگ لڑنے والوں میں سے تھا تو وہ فخر کرے گا۔ اُس وقت وہ محسوس کرے گا کہ جنہیں وہ اور اس کے فرانسیسی آقا دہشت پسند، قاتل اور ڈاکہ زن کہتے رہے ہیں وہ دراصل آزادی کے علمبردار تھے۔

محل کا سینہ فخر سے پھیل گیا مگر اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ اُس نے کبھی کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہیں کیا تھا۔ کبھی کسی کا خون نہیں بہایا تھا۔ اب وہ ایک آدمی کے جسم کے ٹکڑے اڑا دینے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اُسے آزادی کی تنظیم کوئی اور کام دے دیتی۔ دیواروں پر پوٹر لگانے جیسا کام زیادہ خطرناک نہیں تھا لیکن محمود نے اُسے پہلا ہی مشن ایک

آدی کے قتل کا دانتھا۔ اُس کے ہاتھ کاٹنے لگے۔ اُسے اپنے باپ کا بھی خیال آیا جس کے متعلق اُسے ڈرتھا کہ اس فریسی کی کار میں نہ ہو۔ وہ اتنا ڈرا کہ اُس نے تقریباً فیصلہ کر لیا کہ محمود سے جا کر کہہ دے کہ وہ جنگ آزادی کی ابتدا کسی آسان مشن سے کرے گا مگر اُسے ایک اور بات یاد آگئی۔ محمود نے اُسے قبرستان میں لے جا کر چھ سات قبریں دکھائی تھیں اور اُسے کہا تھا کہ ان قبروں میں وہ آدمی دفن ہیں جو ڈر کے مارے یا کسی لالچ میں آکر اپنا مشن پورا نہ کر سکے۔ انہیں محاذ آزادی نے کوئی اردی تھی۔ محمود نے چل سے کہا تھا کہ اگر اُس نے محاذ کو دھوکہ دیا یا ڈر کی وجہ سے مشن پورا نہ کیا تو اُسے بھی قتل کر دیا جائے گا۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنے آپ کو مجبور پایا۔ اتنے میں نیلے رنگ کی ایک

کار آتی نظر آئی۔ چل پر بیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے سڑک کے کنارے جا کھڑا ہونا تھا۔ وہاں سے سڑک توڑے دبے کے زاویے پر مڑتی تھی۔ کار کو آہستہ ہونا تھا۔ چل کو اس کے قریب سے گزرنا اور گریڈ کار کے اندر پھینکا تھا مگر اُس کا شکار موٹر پر رُک گیا کیونکہ آگے آگے اونٹوں کا قافلہ جا رہا تھا جس کے دو تین اونٹ سڑک کے دریاں آگئے تھے۔

چل صرف یہ دیکھ سکا کہ کار میں تین آدمی ہیں۔ اُس نے سٹیرنگ پر بیٹھے ہوئے ایک الجزائر میں مسلمان کو بھی پہچان لیا۔ اُس کا نام منصور الخیری تھا۔ وہ بھی افسر تھا اور غدار تھا۔ اُس نے اپنے دو ماتحتوں کو گرفتار کر دیا تھا کہ وہ نیشنل لبریشن فرنٹ کے درپردہ رکن تھے۔ چل کو خوشی ہوئی کہ وہ ایک تیرے دو شکار مارے گا مگر کار کی پچھل سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جسے وہ پہچان سکا کیونکہ دروازے کا شیشہ اُدھر تھا اور اس پر صبح کی دھوپ پڑ رہی تھی۔ اگلے دروازے کا شیشہ اُتر ہوا تھا۔

چل رُک رہی تھی کہ قریب سے گزرا جیسے صرف گزرا ہوا اور کار کے ساتھ اُسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اُس نے دوسرا ہاتھ بھی گریڈ والی

جیب میں ڈال کر گریڈ کا پین نکال لیا اور گریڈ کو مٹھی میں پکڑ لیا۔ وہ کار کے ساتھ لگ کر گزرا اور اُس نے گریڈ کار کے اگلے دروازے کے اندر پھینک دیا۔ وہ ابھی کار کے قریب ہی تھا کہ دل دہلا دینے والا دھماکا ہوا۔ کار شعلوں کی لمپیٹ میں آگئی اور جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی۔ چل خود بھی زخمی ہو گیا۔ وہ وہیں رُک کر چلانے لگا جیسے کوئی راہرو بے گناہ زخمی ہو گیا ہو۔

کچھ لوگ ادھر ادھر بھاگ گئے۔ اونٹ بدک کر سڑک پر پھیل گئے۔ کچھ لوگ جلتی کار کا تناشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے اور چل ان لوگوں میں شامل ہو گیا۔ بعض نے اس کے ساتھ ہمدردی کی کہ وہ راہ جاتے زخمی ہو گیا ہے۔ وہ بہت خوش تھا کہ اُس کا پہلا ہی مشن اس قدر کامیاب تھا کہ جنہیں مارنا مقصود تھا وہ اُس کے ہاتھ سے مارے گئے اور اُس پر کسی کو شک بھی نہ ہوا۔

وہ محمود کے پاس چلا گیا اور اُسے بتایا کہ وہ اپنا مشن پورا کر آیا ہے اور فریسی افسر کے ساتھ وہ غدار منصور الخیری کو بھی مار آیا ہے۔ ”مگر میں پہچان نہ سکا کہ کار میں تیسرا آدمی کون تھا“۔ چل نے کہا۔ ”وہ بھی کوئی غدار ہی ہوگا“۔ محمود نے کہا۔ ”جہاں مجاہدین مارے جا رہے ہیں وہاں کوئی اور مارا گیا تو کوئی قیامت نہیں آگئی۔“

محمود نے اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر دی۔ چل سینہ تانے ہوئے اپنے گھر چلا گیا۔ وہ ماں سے بچتا بچتا غسل خانے میں چلا گیا۔ اُس نے غسل کیا اور خون آلود کپڑے لمپیٹ کر چھپا دیے تاکہ ماں نہ دیکھ لے۔ وہ غسلی سے نکلا تو اُس کی ماں سامنے آگئی۔ چل نے اُس سے اپنے باپ کے متعلق پوچھا کہ وہ دفتر چلا گیا ہے یا تیار ہو رہا ہے۔

”وہ تالاب پر چلے گئے ہیں“۔ اُسے ماں نے بتایا۔ ”وہ فریسی افسر لگیا تھا۔ اُس کے ساتھ منصور الخیری بھی تھا۔ وہ ہمارے باپ کو کار میں بٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔“

پہل کا دل ڈوب گیا۔ کار میں تیسرا آدمی اُس کا باپ تھا۔ اُس کے ہاتھوں اُس کا باپ بھی مارا گیا تھا۔ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا لیکن اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ وہ باہر نکل گیا اور محمود کے ہاں چلا گیا۔ ”کیا اب بھی تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے؟“ اُس نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ ”میں نے اپنے باپ کو بھی قتل کر دیا ہے۔ میں اپنے باپ کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”اچھا ہوا“ محمود نے کہا۔ ”اچھا ہوا اگر تمہارا باپ بھی مارا گیا ہے۔ خدا اگر باپ ہو تو بھی اُسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔“



## انگریز، انسان اور گدھا

گدھا گدھا ہی ہوتا ہے۔ اسے سجا سنوار کے رکھو، اس کے ساتھ بچوں کی طرح پیار کرو، وہ گدھا ہی رہتا ہے مگر کسی انسان کو جب گدھا سمجھ لیا جائے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہوتا ہے۔ کہانی جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں، یہ دو انسانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ پاکستان میں پیدا ہونے والی نسلیں نے انگریز دیکھے ہوں گے مگر انہیں بڑے بڑے بادشاہوں کے روپ میں نہیں دیکھا۔ وہ ہم نے دیکھا ہے جو اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ انگریز کالی چمڑی والے سے نفرت کرتے اور ہمیں گدھا سمجھا کرتے تھے۔ انگریزوں نے جس ملک پر بھی حکومت کی، وہاں کے انسانوں کو انہوں نے گدھا سمجھا۔ اور ایک ہمارا میجر ڈگلس کرتھا جو لیبیا کے ایک بدو کو گدھا سمجھ بیٹھا۔ اگر میجر ڈگلس کرا بھی تک زندہ ہے تو وہ اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد سے ضرور کہتا ہو گا کہ کسی انسان کو گدھا نہ سمجھنا۔ یہ واقعہ دوسری جنگ عظیم کا ہے۔ میں سگنل کور میں میجر ہوا کرتا تھا۔ میں آپ کو جنگ کے واقعات انہیں سناؤں گا۔ ان حضرات کو جنہیں جنگ کا زمانہ یاد ہے، یاد دلاؤں گا کہ جرمنی کی فوج شمالی افریقہ میں لیبیا میں آگئی تھی۔ آپ کو جرمن جنرل رومیل کا نام یاد ہو گا جس نے شمالی افریقہ پر حملہ کر کے انگریزوں کی فوج کو بُری طرح پسپا کیا تھا۔ پسپا ہونے والوں میں انگریزوں کی ہندوستانی فوج بھی تھی۔ پھر نول ہوا کہ انگریزوں امریکی فوج اور ایئر فورس کی مدد سے جوابی حملہ کیا۔ ادھر رومیل کو اپنے ہی

dunovelspdf.com

book.com/urdunovelspdf



ڈکٹیٹر بٹلر نے دھوکہ دیا۔ جرمن فوج پسپا ہو گئی اور اُسے افریقہ سے نکلنا پڑا۔ بن غازی اور العالمین کے ریگستان میں تاریخ کی سب سے بڑی ٹینکوں کی جنگ لڑی گئی تھی۔

جرمنی کی پسپائی کے بعد اس صحرائی حالت بڑی ہی خوفناک اور عبرتناک تھی۔ گاؤں اُبڑ گئے تھے۔ وہاں گدھوں، گیدڑوں اور لومڑیوں کی حکمرانی تھی۔ لاشیں ہر طرف بکھری ہوئی تھیں۔ جلے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے ٹینکوں اور دیگر فوجی گاڑیوں میں بھی یہ مردار خور پرندے اور درندے نظر آتے تھے۔ انسانوں کی کھوپڑیاں اور ہڈیاں تو ہر جگہ دکھائی دیتی تھیں۔ میں اُس وقت بن غازی سے سیس بنیں میل دور ایک فوجی پوسٹ میں تھا جو کچی دیواروں کا قلعہ سا تھا۔ اس میں سنگنز کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ انٹیلی جنس کا انگریز عملہ بھی تھا۔ اس علاقے میں اب جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اتحادی (انگریز اور امریکی) بحیرہ روم عبور کر کے اٹلی کو فتح کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ہم لوگ آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔

میجر وگلنس کر کا تعلق برٹش انٹیلی جنس سے تھا۔ وہ اُس علاقے

کی زبان جو عربی کی ذرا سی بگڑی ہوئی صورت تھی، بڑی اچھی طرح بولتا اور سمجھتا تھا۔ ہمارے ملازم (بیرے، گائیڈ اور دیگر چھوٹے موٹے کام کرنے والے) اُسی علاقے کے رہنے والے لوگ تھے۔ وہ عربی لہجہ پہنتے اور عربی زبان بولتے تھے۔ ان میں زیادہ تر بدو تھے۔ وہ ایسے علاقوں کے رہنے والے تھے جہاں تک باہر کی دنیا کے لوگ کم ہی پہنچ سکتے تھے۔

صحرائے متعلق میں تھوڑی سی وضاحت کر دیتا ہوں۔ جنہوں نے صحرائیں دیکھا وہ صحرا کو افنی تک پھیلا ہوا ایک میدان سمجھتے ہیں جس میں ریت ہی ریت ہوتی ہے۔ اللہ آپ کو صحرا سے بچائے۔ یہ زیادہ تر میدان ہی ہوتا ہے لیکن اس میں گنبد نما ٹیکریاں بھی ہوتی ہیں جن کے

اندر چلے جاؤ تو ان سے نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہ بھول بھلیاں سی ہوتی ہیں۔ صحرائیں ریت اور مٹی کے ٹیلوں کے علاقے بھی ہوتے ہیں عجیب عجیب شکلوں کے ٹیلے کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کی شکلیں ڈراؤنی اور ہیبتناک ہوتی ہیں۔ صحرائوں میں نخلستان بھی ہوتے ہیں۔ وہاں پانی ہوتا ہے اور درخت بھی ہوتے ہیں۔ صحرا کے قبائلی جنٹیں عام طور پر بدو کہا جاتا ہے ایسے ہی علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان کا پیشہ لوٹ مار تھا۔

جنگ کے بعد وہاں بدو ہی رہ گئے تھے۔ وہ فوجی افسروں کے ملازم تھے۔ اُن کا پیشہ تو رہنزی اور چوری چکاری تھا لیکن جہاں ملازمت کرتے وہاں چوری نہیں کرتے تھے۔ ہمیں ذاتی ضروریات کی بعض اشیاء بن غازی سے لانی پڑتی تھیں۔ انگریز افسر شراب لاتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کئی ایک چیزیں تھیں۔ اب چونکہ جنگ بحیرہ روم سے آگے چلی گئی تھی اس لیے ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کوئی ایک افسر چپ لے کر بن غازی چلا جاتا اور سامان لے آتا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک بدو ملازم ضرور ہوتا تھا۔

ایک صبح میجر وگلنس کر جب چپ لے کر بن غازی کو روانہ ہوا اس کے ساتھ ایک بدو عبد اللہ کلالہ گیا۔ اس انگریز میجر کو بعض افسروں نے کچھ چیزیں لانے کے لیے پیسے دیئے تھے۔ کچھ سرکاری سامان بھی لانا تھا۔ اُسے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹوں کے بعد واپس آ جانا چاہیے تھا۔ وہ صبح سات بجے نکلا تھا مگر بارہ بج گئے، واپس نہ آیا۔ اُس وقت تک تو وہیں کوئی فکر نہ ہوا۔ جب اڑھائی بج گئے تو کچھ تشویش ہونے لگی۔ تشویش تو اُس وقت بھی نہ ہوتی، خطرہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ آندھی آئی تھی۔ صحرائی آندھی مسافروں کے لیے بڑی خوفناک ہوتی ہے۔ ایک قدم آگے تک کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی رک کر بیٹھ جائے تو چند منٹ میں وہ ریت میں دب جاتا ہے۔ اُس پر ریت کی قبر بن جاتی ہے، اس لیے آندھی میں مسافر رکتے نہیں۔ اگر آندھی کی تندہی زیادہ ہو تو مسافر اس کے زو

آیا۔ رات کو اُسے تلاش کرنے کے لیے گاڑیوں میں پارٹیاں بھیج دی گئیں۔  
ہر گاڑی میں وائرلیس سیٹ تھا۔

آدھی رات کے بعد ایک پارٹی نے اطلاع دی کہ میجر ڈگلز کڑ  
مل گیا ہے۔ میں بھی ایک تلاش پارٹی کے ساتھ گیا تھا۔ واپس آیا تو معلوم  
ہوا کہ میجر ڈگلز کڑ ہسپتال میں ہے۔ وہ بہت بُری حالت میں ملا تھا۔ پیال  
اور ٹھکن سے اُس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ وہ جیب پر نہیں تھا۔ جیب دُور  
کمیں کھڑی تھی۔ اس کے چاروں ٹائروں سے ہوائی ہوئی تھی جیب  
دوسرے دن لائی گئی۔ اس کے ساتھ عبداللہ کلالہ نہیں تھا۔

اگلے روز شام کو اُسے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ اُس کے ساتھ  
جو گزری تھی وہ میں اپنے الفاظ میں سُنا تا ہوں۔ وہ بن غازی سے سامان  
خرید کر آیا تھا۔ آدھے راستے میں تھا کہ آدھی آگئی۔ میں بتا چکا ہوں کہ صحرائی  
آدھی کیسی ہوتی ہے جیب کینوس سے ڈھکی ہوئی تھی لیکن اگلی سیٹ  
کے دونوں طرف کھلی تھی یعنی اس کے دروازے نہیں تھے۔ آدھی دائیں  
طرف سے آ رہی تھی اس لیے ریت اس طرح اندر آ کر منہ کو لگتی تھی جیسے  
کھلے منہ والے نلکے سے بہت تیز پانی آ رہا ہو جیب کا اگلا حصہ بھی  
نظر نہیں آتا تھا جیب کو روک لینا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ روکنے کی صورت

میں ریت اتنی جمع ہو جاتی کہ جیب کے پچھلے ریت میں دب جاتے اور  
گاڑی کو وہاں سے نکالنا مشکل ہو جاتا۔ صحرائی آدھی سے ریت کے ٹیلے  
ذو ذرہ ہو کر غائب ہو جاتے ہیں اور جہاں کچھ رکاوٹ آ جائے وہاں ٹیلے  
بن جاتے ہیں۔ انہی کو متحرک ٹیلے، کہا جاتا ہے۔

میجر ڈگلز کڑ جیسا دانشمند اور ہوشیار افسر ہوش کھو بیٹھا۔  
دانشتہ یا غیر دانشتہ جیب کا رُخ مڑ گیا۔ نیچے مڑک ہوتی، کوئی نشان  
ہوتے تو یقین ہوتا کہ جیب سیدھی جا رہی ہے۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔  
آدھی تھی اور نظر کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ چونکہ میجر ڈگلز کڑ کے منہ پر دائیں طرف  
سے ریت کی بوجھاڑیں پڑ رہی تھیں اس لیے اُس کی جیب کا رُخ اُس

سے راستے سے ہٹتے ہٹتے بھٹک جاتے ہیں۔  
آدھی نو دس بجے کے وقت آئی اور ایک گھنٹہ بعد گز گئی تھی۔  
بن غازی تک کوئی پتی مڑک یا باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ ہماری فوجی گاڑیوں  
نے ایک راستہ بنا رکھا تھا۔ میجر ڈگلز کڑ پیدل نہیں جیب پر تھا اور اس  
کے ساتھ تجربہ کار بدو تھا۔ کوئی ایسا خطرہ تو نہیں تھا، سوائے اس کے  
کہ جیب خراب ہو گئی ہوگی۔

چار بج گئے تو افسروں نے کہا کہ اب ایک گاڑی بھیج دینی چاہئے۔  
چنانچہ ایک جیب میں موٹر کینک، پٹرول کے دو کین اور کچھ اور ضروری  
سامان رکھ کر مجھے کہا گیا کہ میں جاؤں۔ میں چلا گیا۔ راستے میں کہیں بھی میجر  
ڈگلز کڑ کی جیب نظر نہ آئی۔ میں بن غازی تک چلا گیا۔ دو دکانداروں  
سے مجھے واقفیت تھی۔ اکثر ان سے سامان خریدا جاتا تھا۔ انہوں نے  
بتایا کہ میجر ڈگلز کڑ نو بجے ان سے سامان خرید کر چلا گیا تھا۔ میں شہر سے  
نکلا تو فوجی چیک پوسٹ پر رُک گیا۔ وہاں ایک انگریز میجر نے بتایا کہ میجر  
ڈگلز کڑ نو بجے کے لگ بھگ شہر سے نکلا، اس کے پاس ذرا سی ویر  
کے لیے رُکا اور چلا گیا تھا۔ اُس نے کہا کہ آدھی نے اُسے راستے میں  
گھیر لیا ہوگا۔ کہیں بھٹک نہ گیا ہو۔

”ایٹلی جنس کا افسر ہے“ میں نے کہا۔ ”یہاں کی زبان بھی جانتا  
ہے۔“

”وہ شاید یہاں کے بدوؤں کو نہیں جانتا۔“ اس انگریز میجر  
نے کہا۔ ”اگر وہ آدھی میں بھٹک کر بدوؤں کے علاقے میں چلا  
گیا تو صورتِ حال خاصی مختلف ہوگی۔“

اس سے مجھے کچھ خطرہ محسوس ہونے لگا۔ میں واپس اپنے ہیڈ کوارٹر  
میں پہنچا۔ وہاں گاڑی تیز نہیں چل سکتی تھی کیونکہ کوئی یکا راستہ نہیں تھا۔  
ریت تھی۔ ریت کی ٹیکریاں تھیں۔ بیس میل کا فاصلہ دو گھنٹے میں طے ہوتا  
تھا۔ میں ہیڈ کوارٹر میں پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ پتہ چلا کہ میجر ڈگلز کڑ نہیں

کے ہاتھوں مڑتا رہا۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد آندھی کا زور ختم گیا اور ماحول نظر آنے لگا۔ میجر ڈگلز کو نے جیب پھر بھی نہ روکی۔ جب انصاف بالکل صاف ہو گئی تو اُس نے جیب روکی۔ اتر کر ادھر ادھر دیکھا تو اُسے وہ علاقہ غیر مانوس نظر آیا۔ اُس نے عبداللہ گلدار کی طرف دیکھا۔ گلدار نے اُسے بتایا کہ وہ راستے سے بہت دُور آگیا ہے۔ یہ بدو صحرا کا بھیدی تھا۔ اُس نے ہر طرف دیکھ کر ایک طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس سمت چلیں تو تین گھنٹوں میں ہیڈ کوارٹر پہنچ جائیں گے۔

میجر ڈگلز کو نے جیب چلا دی۔ دو اڑھائی میل دُور ٹیوں کا علاقہ دکھائی دے رہا تھا۔ جیب کو ریت چلنے نہیں دے رہی تھی

میجر ڈگلز کو نے جیب روک لی۔ اُسے اپنے سامنے ریت میں کچھ چمکتی ہوئی چیزیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ان چیزوں کو اچھی طرح پہچانے تھا۔ یہ بارودی سرنگیں تھیں۔ ان کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ علاقہ میدان جنگ رہا تھا۔ یہاں مورچے بنے تھے۔ پوشیں بھی تھیں اور کمپ بھی لگے تھے ایسی جگہوں کے سامنے کے علاقے میں بارودی سرنگیں بچھا دی جاتی تھیں۔ بارودی سرنگ (مائن) زمین میں دبائی جاتی ہے۔ اس کی ایک پن سی زمین سے باہر ہوتی ہے۔ اس پر ریت یا مٹی ڈال کر چھپا دیا جاتا ہے اس پر پاؤں آجائے تو پن دب جانے سے بارودی سرنگ پھٹ جاتی اور انسان کو مار ڈالتی ہے۔ جرنیوں کی بارودی سرنگیں زیادہ خطرناک تھیں۔ ان کی دبائی ہوئی سرنگیں ایک تار سے ایک دوسری سے ملاتی ہوئی ہوتی تھیں۔ تار میں پاؤں پھنس جائے تو سرنگیں پھٹ جاتی تھیں۔ میجر ڈگلز کو کے آگے جو سرنگیں آگئی تھیں وہ جرنیوں کی بچھائی ہوئی معلوم ہوئی تھیں۔ آندھی نے ان سے ریت ہٹا دی تھی اور ایک تار دکھائی دے رہی تھی۔ جب فوجیں پسپا ہوتی ہیں تو وہ بارودی سرنگیں بچھی ہوئی چھوڑ جاتی ہیں۔ جنگ کے بعد اکثر لوگ ان سے ہلاک اور زخمی ہوتے رہتے ہیں۔

جس علاقے میں سرنگیں بچھائی جاتی ہیں، اسے مائن فیلڈ کہتے ہیں۔ میدان جنگ میں رہنے والے بدوؤں نے جنگ کے بعد مائن فیلڈ کا سراغ لگانے کے لیے ایک دلچسپ طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ ان کے پاس اونٹنوں کے علاوہ گدھے بھی ہوتے تھے۔ وہ جب خانہ بدوشوں کی طرح نقل مکانی کرتے تو بڑی احتیاط سے چلتے تھے۔ جہاں انہیں شک ہوتا کہ آگے مائن فیلڈ ہے وہاں وہ ایک گدھے کو مار کر آگے کو بھگا دیتے تھے۔ اگر بارودی سرنگیں ہوں تو گدھے کے پاؤں کے نیچے آکر ایک سرنگ پھٹ جاتی اور اگر یہ تار سے منسلک ہوں تو ساری سرنگیں پھٹ جاتی تھیں۔ گدھے کے جسم کے تو ٹکڑے ہو جاتے تھے مگر بدوؤں کا پورا خاندان بچ جاتا تھا۔

میجر ڈگلز کو کو بدوؤں کا یہ طریقہ معلوم تھا مگر اُس کے پاس گدھ نہیں تھا۔ صرف عبداللہ گلدار تھا جو بدو تھا اور اُس کا نوکر۔ گلدار بھلا مانس انسان تھا۔ کام محنت اور دیانتداری سے کرتا تھا۔ میجر ڈگلز کو نے اُس سے گدھے کا کام لینے کی سوچ لی۔ اُسے یقین تھا کہ گلدار چونکہ ملازم ہے اور اپنے قبیلے سے دُور رہتا ہے اس لیے اُسے معلوم ہی نہیں ہوگا کہ اُسے بارودی سرنگوں کا سراغ لگانے یا انہیں بچھانے کے لیے آگے بھیجا جا رہا ہے۔ میجر ڈگلز کو نے گلدار سے کہا کہ وہ آگے جائے اور کچھ دُور جا کر سمت کا معجم تعین کرے۔ اس انگریز نے ایک بدو کو اپنی سلامتی کے لیے قربان کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس کے لیے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ دونوں طرف ریت کے ٹیلے تھے جن میں سے جیب نہیں گذر سکتی تھی۔

گلدار فوراً آگے چلا گیا۔ وہ چند قدم گیا ہوگا کہ میجر ڈگلز کو زمین پر لیٹ گیا کیونکہ اُسے توقع تھی کہ گلدار کے کسی نہ کسی قدم کے نیچے بارودی سرنگ پھٹے گی اور اُس کا کوئی اُڑتا ہوا ٹکڑا میجر ڈگلز کو کو لگ سکتا ہے مگر کوئی دھماکہ نہ ہوا۔ اُس نے دیکھا گلدار نیچے دیکھتا اور کبھی دائیں کبھی بائیں ہو کے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ بعض جگہ وہ پاؤں ذرا اونچا اٹھا کر آگے رکھتا

تھا۔ اس طرح چلتے وہ ڈیڑھ دو سو گز دور نکل گیا پھر واپس آنے لگا۔ وہ پہلے کی طرح چلتا واپس آ گیا۔

وہ میجر ڈگلس کڑکی طرف آنے کی بجائے جیب کی طرف گیا۔ اگلی سیٹ پر میجر ڈگلس کڑکار یا اور پڑا تھا۔ میجر نے بلیٹ اتار کر سیٹ پر رکھی ہوئی تھی۔ ریوا اور اسی میں تھا اور اس کے پلوچ میں ریوا اور کی گولیاں پڑی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میجر ڈگلس کڑا سے کہتا کہ وہ اُس کے ریوا اور کے ساتھ نہ کھیلے، گلا لہ ریوا اور میں چھ گولیاں ڈال چکا تھا۔ میجر ڈگلس کڑا اٹھا عبد اللہ گلا لہ نے ریوا اور کی نالی اُس کی طرف کر دی۔

”میں انسان ہوں گدھانہیں ہوں۔“ عبد اللہ گلا لہ نے کہا۔ ”تم نے مجھے آگے بھیجا تھا کہ میں مرکز متارے سے یہ راستہ صاف کر دوں گا یا تم راستہ بدل لو گے۔ میں جہاں سے گزر کر گیا اور واپس آیا ہوں وہاں بے شمار بارودی سرنگیں ہیں۔ اندھی نے سب کو ننگا کر دیا ہے اس لیے میں دیکھ بچھ کر چلتا زندہ واپس آ گیا ہوں مگر میں اپنی بے عرقی کا انتقام لوں گا تم نے مجھے گدھا سمجھ کر میری جان لینے کی کوشش کی۔ میں جانتا ہوں میرے قبیلے کے لوگ بارودی سرنگوں کا سراغ لگانے کے لیے گدھے کو آگے بھیجا کرتے ہیں۔“

میجر ڈگلس کڑ نے اُس کی طرف بڑھتے ہوئے افسروں کی طرح حکم دیا کہ وہ ریوا اور اُسے دے دے۔

”فرنگی! عبد اللہ گلا لہ نے کہا۔“ میں نے تمہارا ننگ کھا ہے اس لیے تمہیں قتل نہیں کروں گا مگر تم پیدل جاؤ گے۔ اگر جھٹک جھٹک کر مر جاؤ تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ چلے جاؤ۔ اگر رُکے رہے تو گولی مار دوں گا۔۔۔ چلے جاؤ۔“

بدو کے تیور دیکھ کر میجر ڈگلس کڑ ایک طرف چل پڑا۔ کچھ دور جا کر وہ رُکا اور گھوم کر عبد اللہ گلا لہ کی منت کی کہ وہ اسے جیب دے دے گلا لہ نے ہوا میں ایک راؤنڈ فائر کر کے کہا۔ ”پیدل جاؤ۔ مجھے گدھا سمجھو۔“

میجر ڈگلس کڑ چل پڑا۔ دور جا کر اُس نے پیچھے دیکھا۔ عبد اللہ گلا لہ جیب کے ایک پیسے کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ شاید مار سے ہوا نکال رہا تھا۔ ہم نے جیب ڈھونڈ لی تھی تو اس کے چاروں ہاتروں سے ہوا بالکل نکلی ہوئی تھی۔ گلا لہ تمام سامان جو میجر ڈگلس کڑ نے بن غازی سے خرید تھا اور شراب کی بوتلیں بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ پھر وہ بھی نظر نہ آیا۔ میجر ڈگلس کڑ مارا مارا پھرتا رہا۔ پیاس نے اُسے ادھڑا کر دیا۔ رات کی خنکی نے اُسے بچا لیا۔ اگر وہ رات کو مل نہ جاتا یا کہیں دور نکل جاتا تو اگلے روز اُس کا زندہ رہنا نامکن تھا۔ وہ شاید اس لیے زندہ رہا تھا کہ انگریز افسروں کو بتائے کہ انسان گدھانہیں ہوتا۔





## نور عنایت خان

PDF

جنگ عظیم دوم ۱۹۳۹-۴۵ء سے پہلے فرانس کے ”ریڈیو پیرس“ سے بچوں کے پروگرام میں ایک بڑی ہی پیاری نسوانی آواز سنائی دیا کرتی تھی جو بچوں کو پروں کی کمانیاں سنایا کرتی تھی۔ یہ آواز جس خاتون کی تھی اُس نے بچوں کے لیے کمانیوں کی متعدد دکتا بن لکھی تھیں۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جرمنی نے فرانس پر حملہ کیا۔ فرانس میں فرانسیسی فوج کے ساتھ بیلعنم کی فوجیں بھی تھیں۔ جرمنوں کی بکتر بندیلغا لڑائی شدید اور تیز تھی کہ مٹیوں ملکوں کی فوجیں غیر فوجی طریقے سے بھاگ اٹھیں۔ فرانس پر جرمنی کا قبضہ ہو گیا۔ شہری بھی بھاگے جن میں سے کچھ تو برطانیہ اور فرانس کے درمیانی سمندر میں ڈوب گئے بعض برطانیہ پہنچ گئے اور خاصی آبادی کو جرمن استبداد میں فرانس میں ہی رہنا پڑا۔ جنگ عظیم شدت اختیار کر گئی۔ برطانیہ کی آزادی خطرے میں پڑ گئی۔ احوال و کوائف بتاتے تھے کہ ہٹلر (جرمنی کا ڈکٹیٹر) چند دنوں میں برطانیہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو جائے گا۔ توپوں اور ہتھیاروں کی جنگ لڑی جاتی رہی اور اس کے ساتھ ہی ایک زمین دوز جنگ شروع ہو گئی جو فضا کی غیر مرئی لہروں پر بھی لڑی جاتی تھی۔ یہ جنگ لڑنے والے باوردی فوجی نہیں تھے

نہ وہ کسی کو نظر آتے تھے۔ یہ جا سوسوں اور گوریلا افراد کی جنگ تھی جو اُن تمام ملکوں میں لڑی جا رہی تھی جن پر جرمن فوجوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ یہ محاذ جس ملک میں سب سے زیادہ گرم ہوا وہ فرانس تھا۔ اس ملک کے باشندوں نے ایک خفیہ تحریک چلائی تھی جسے تحریک مزاحمت کا نام دیا گیا تھا۔ اس تحریک کے افراد جرمنوں کے گولہ بارود اور رسد کے ذخیروں کو تباہ (سبوتاژ) کرنے کے علاوہ بذریعہ وائرس برطانیہ کی سیکرٹ سروس کو پیغامات اور جرمنوں کے راز دیتے رہتے تھے۔ ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ جرمنوں کو فرانس میں امن اور سکون سے نہ رہنے دیا جائے۔ وہ جرمن افسروں کو خفیہ طریقوں سے قتل بھی کرتے تھے اور فرانس کے نظام مثلاً ریلوے، ڈاک وغیرہ کی خرابی کا بھی اہتمام کرتے تھے۔

فرانسیسیوں نے ”تحریک مزاحمت“ کو جرمنوں کی تباہی کا ذریعہ بنالیا تو برطانیہ نے اس تحریک کی مدد کے لیے پیرا سٹولٹ کے ذریعے فرانس میں تربیت یافتہ جاسوس، تخریب کار اور گناہ دانے شروع کر دیے۔ انہوں نے یہاں تک خطرہ مول لیا کہ فرانس کے جنگلوں اور بیابانوں میں راستے وقت چھوٹے پتارے اتار کر اپنے آدمی فرانس میں داخل کر دیتے تھے۔ انہیں ”تحریک مزاحمت“ کے خفیہ مراکز بتا دیے جاتے تھے۔ اکثر یہ انتظام کیا جاتا کہ خفیہ الفاظ میں بذریعہ وائرس ”تحریک مزاحمت“ کو جگہ اور وقت بتا دیا جاتا تھا کہ فلاں وقت فلاں جگہ ایک یا دو آدمی اتارے جا رہے ہیں۔ چنانچہ وہاں اُترنے والوں کا باقاعدہ استقبال ہوتا تھا۔

”تحریک مزاحمت“ کے کارکنوں کے سروں پر ہر وقت بڑی ہی اذیت ناک موت منڈلاقی رہتی تھی۔ جرمنی کی سیکرٹ سروس انہیں پکڑنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ جرمنی کی یہ سروس غیر معمولی طور پر ذہین، تیز اور سرانگہ سانی کی ماہر تھی۔ اس کے ساتھ جرمنی کی مشہور

سروس ”گیشاپو“ تھی۔ گڑی کی طرح اس کے بے شمار بازو اور ٹانگیں تھیں۔ اس کے تنے ہوئے جالے میں سے کسی کا بچ نکلنا عموماً ناممکن ہوتا تھا۔ ”گیشاپو“ کی اذیتیں اس قدر غیر انسانی تھیں جن کی تفصیل سن کر ہی دل دہل جاتا ہے۔ جو زمین دوز کارکن گیشاپو کے ہاتھ لگ جاتے اُسے اذیتیں مجبور کر دیتی تھیں کہ اپنے ساتھیوں کو بھی وہ گرفتار کرادے۔ یہ اذیتیں جسمانی ہوتی تھیں اور نفسیاتی بھی۔ چونکہ فرانس میں تحریک مزاحمت، جڑ پکڑ گئی اور اس کی تباہ کاریاں جرمنوں کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تھیں اس لیے جرمنوں نے اپنی سیکرٹ سروس اور ”گیشاپو“ کے سرانگہ سالوں اور درندہ صفت جرمنوں کی ایک فوج فرانس میں پھیلا دی۔ یہاں سے برطانیہ اور جرمنی کی سیکرٹ سروسوں کی ایسی جنگ شروع ہو گئی جو زمین کے نیچے اور فضا کی لہروں پر لڑی گئی۔

اس خاتون کی کہانی سننے سے پہلے جس کی آواز جنگ عظیم سے پہلے ریڈیو پیرس سے سنائی دیا کرتی تھی، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جان پھیل جانے والے اُن افراد کے متعلق کچھ بتا دیا جائے جو برطانیہ سے فرانس بھیجے جاتے تھے۔ ہر ایک فوجی کو اس کام کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے لیے غیر معمولی خصوصیات کی ضرورت تھی۔ مثلاً بے خوفی، خود اعتمادی، قوت ارادی اور قوت فیصلہ، ذہانت اور حاضر دماغی۔ جسمانی لحاظ سے اتنی قوت درکار تھی کہ فینڈ بھوک، پیاس اور شقت کو اُس سے کمیں زیادہ دن برداشت کر سکے جو ایک اوسط درجہ تندرست انسان کر سکتا ہے۔ ضدی بچے کی طرح استقلال ہو۔ صبر و تحمل اور فرض کے ساتھ چپکے رہنے کی صلاحیت ہٹ دھرمی کی حد سے زیادہ ہو۔ پکڑے جانے کی صورت میں اذیتیں برداشت کر سکے اور اتنی بہت رکھتا ہو کہ اس کا جسم کٹتا رہے وہ اپنے کسی ساتھی کی نشاندہی نہ کرے اور جرمنوں کو کوئی راز نہ دے۔ تصور

ٹیپو شہید برصغیر میں سلطنت اسلامیہ کی ترکش کا آخری تیر تھا۔ وہ بھی کمان سے نکل گیا تو برصغیر میں انگریزوں کی حکومت کے قیام کے راستے میں کوئی مزاحمت نہ رہی۔ سلطان ٹیپو شہید کی اولاد ٹیپو برصغیر میں کبھر گئی اور زیادہ تر افراد جنگال چلے گئے۔ انہیں اپنا غلام بنانے کے لیے انگریزوں نے ان کی پنشنیں مقرر کر دی تھیں۔ ان میں بعض برصغیر سے نکل گئے۔ تاریخ میں سلطان ٹیپو کے دو بیٹوں کا سراغ ملتا ہے جو انگلستان چلے گئے تھے۔ ان میں ایک جامع الدین تھا جس کی عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ بڑے بھائی کا نام غلام محمد تھا۔ اس کی صحیح عمر معلوم نہیں، نوجوانی کی عمر میں داخل ہو چکا تھا۔ اُس وقت ملکہ وکٹوریہ کا راج تھا۔ اُس نے دونوں بھائیوں کو شاہی مراعات دیں اور انہیں انگلستان کی شہریت بھی دی۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ نور النساء (نور عنایت خان) کے والد سلطان ٹیپو کے کون سے بیٹے کی اولاد کی اولاد تھے۔ ولیم سیٹونسن نے اپنی اُس کتاب میں جس میں نور کا کارنامہ لکھا ہے یہ تحریر کیا ہے کہ نور کے والد کو ۱۹۱۲ء میں زار روس نے روس میں اس مقصد کے لیے بلایا تھا کہ اُسے تصوف (صوفی ازم) پڑھائیں۔ نور کرملین (روس) میں پیدا ہوئی تھی۔ سیٹونسن نے اپنی کتاب میں نور کے متعلق لکھا ہے:

”وہ شیر میسور کی نسل میں سے تھی جو جنوبی ہندوستان کا آخری مسلمان تاجدار تھا۔“

نور عنایت خان کی ماں امریکی تھی۔ اُس کے والد اسلام کے اس اصول کے علمبردار تھے کہ غیر انسانی حربوں کو محبت اور بردباری کا ہتھیار بیکار کر دیتا ہے۔ نور بھی اسی فلسفے کی قائل تھی۔ والد نے اُسے تصوف کی تعلیم دی تھی۔ نور نے جب جوانی میں قدم رکھا تو جرمنی نازی ازم کی گرفت میں آ گیا تھا۔ جرمنی کے ڈکٹیٹر حکمران ہٹلر نے اپنی قوم کو نازی بنا کر اُس کے ذہن میں یہ ڈالاکہ کہ جرمن قوم دنیا کی تمام

کیا جاسکتا ہے کہ اتنی صلاحیتیں دس ہزار میں سے کسی ایک انسان میں ہی ہو سکتی ہیں۔ وہ افراد جنہیں بذریعہ پیرا شوٹ یا کسی دیگر خفیہ ذریعے سے فرانس میں اتارا جاتا تھا وہ اپنے آپ کو یقین دلا کے جاتے تھے کہ وہ زندہ واپس نہیں آ سکیں گے۔

عقل تسلیم کرنے سے ہچکچاتی ہے کہ کوئی عورت دشمن کے ملک میں ان حالات میں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں ایسے خطرناک مشن پر جاسکتی ہے، لیکن اب جو خفیہ ریکارڈ سامنے آئے ہیں ان میں دو عورتوں کے نام ملتے ہیں جو فرانس میں داخل ہوئیں اور انہوں نے جاسوسی اور تباہ کاری کی۔ ایک فرانسیسی عورت تھی جس کا نام بوئی رول تھا۔ وہ فرانس کے ساحل پر کشتی میں سے اترتی تھی۔ وہ کبلی تھی۔ فرانس میں ”تحریک مزاحمت“ کے ایک خفیہ اڈے تک پہنچ گئی۔ ایک دو سال سا بوتاز اور جاسوسی کرتی رہی اور کپڑی گئی۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے اُس نے دو جرمن سپاہیوں کو ریاوار سے زخمی کیا۔ یہ سپاہی اُسے رائلفلوں کے بٹوں سے مار رہے تھے۔ اُسے بے ہوشی کی حالت میں پکڑا گیا۔ ایک بے عرصے تک اُسے ان تمام اذیتوں سے گزارا گیا جو جرمنوں نے ایجاہ کی تھیں لیکن اس عورت نے جرمنوں کو کچھ نہ بتایا۔ آخر اسے گیس چیمبر میں گیس سے ہلاک کر دیا گیا۔

قارئین کے لیے یہ انکشاف عجیب ہو گا کہ دوسری عورت جو برطانیہ کی سیکرٹ سروس کی طرف سے ایک گورلا پارٹی کے ساتھ وائٹس آپریٹ کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے فرانس میں اتاری گئی تھی وہ مسلمان تھی اور سلطان ٹیپو شہید کی اولاد کی اولاد میں سے تھی۔ اُس کا نام نور النساء تھا۔ برطانیہ کی سیکرٹ سروس کے ریکارڈ میں اُس کا نام نور عنایت خان تحریر ہے۔ عنایت خان اس کے والد تھے۔

سلطان ٹیپو کے بارہ بیٹے تھے۔ سلطان کی شہادت (۳۴ مئی ۱۷۹۹ء) کے وقت اُس کے بیٹوں کے بیٹوں کی تعداد چوبیس تھی۔ سلطان

قوموں سے برتر اور افضل ہے اور ساری دنیا پر حکمرانی کا حق صرف جرمن قوم کو حاصل ہے۔ اپنی قوم میں برتری کا یہ احساس پیدا کر کے ہٹلر نے دوسری قوموں کے خلاف نفرت پیدا کی اور تشدد کی تعلیم دی۔ اُس وقت یورپی اقوام صوفی ازم کے اصولوں کو اپنانے لگی تھیں ہٹلر نے جرمنی میں صوفی ازم کے پرچار کی ممانعت کر دی۔ نوزکستی تھی کہ صوفی ازم نازی ازم کو ختم کر دے گا۔ بہر حال تحریروں سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ عنایت خان عالم تھے اور انہوں نے اپنی بیٹی نور کو بھی علم و فضل سے مالا مال کر دیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم سے پہلے نوز ہندوستان گئی۔ وہاں سے فرانس چلی گئی۔ اُس وقت تک وہ انگریزی زبان میں بچوں کے لیے کہانیوں کی متعدد وکتابیں لکھ چکی تھیں جو لندن کے ایک ناشر نے چھاپی تھیں۔ اُس کی کہانیاں پڑیوں سے متعلق رکھتی تھیں اور ان میں پیار اور محبت کا رنگ نمایاں ہوتا تھا۔ وہ جب فرانس گئی تو اسے ریڈیو پر سننے بچوں کے پروگرام کے لیے رکھ لیا۔ فرانسیسی زبان میں اسے انگریزی زبان میں مسمارت تھی۔ وہ ریڈیو پیرس سے بچوں کو کہانیاں سناتے لگی، اور اس دوران جرمنی نے فرانس پر یلغار کر دی۔ فرانسیسیوں نے اپنے ملک کے لیے میگنٹ لائن کے نام سے دفاعی انتظامات کر رکھے تھے جنہیں وہ ناقابل تسخیر سمجھتے تھے، بلکہ ساری دنیا فرانسیسیوں کی میگنٹ لائن کو ناقابل تسخیر سمجھتی تھی مگر جرمنی کے ٹینکوں کے آگے یہ ناقابل تسخیر دفاع ریت کی ڈھیریاں ثابت ہوا۔ فرانسیسی قوم اور فوج کا مورال ریزہ ریزہ ہو گیا۔ فوج بھی بھاگ اٹھی۔ جرمنی کی فوج نے تشدد کی پالیسی اختیار کی اور جو فرانسیسی بھاگ نہ سکے انہیں دہشت زدہ کر کے اپنا حامی اور مخبر بنانے لگے۔

نور عنایت خان کی عمر پچیس سال تھی اور غیر معمولی طور پر خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ فرانس میں پھنس گئی۔ لندن کے اس ناشر نے جو اس کی

تباہی میں چھاپا کرتا تھا اُسے ڈرامائی طریقے سے فرانس سے فرار کر لیا اور لندن لے گیا۔ نور کے دل میں انگریزوں کی اتنی محبت نہیں ہونی چاہئے تھی جتنی کا اُس نے علماً اظہار کیا، کیونکہ انگریز اس کے جد امجد کے دشمن تھے۔ سلطان ٹیپو انگریزوں کے خلاف لڑتا شہید ہوا تھا، لیکن نور کے دل میں نازی جرمنی کی جو نفرت تھی وہ غالب آگئی۔ وہ تشدد اور استبداد کے خلاف لڑنا چاہتی تھی۔ برطانیہ کی فضائیہ (رائل ایئر فورس) کو عورتوں کی ضرورت تھی۔ نور نے اپنی خدمات پیش کیں تو اسے مکش دے کر ایئر فورس میں افسر بنا دیا گیا۔ ایئر فورس کے مردانہ فعل نے مشاہدہ کیا کہ نور عنایت خان میں کوئی اور ہی صلاحیت ہے اور وہ ایئر فورس کی افسر سے بہتر کام کر سکتی ہے۔

۱۹۴۱ء کا آغاز تھا۔ فرانس میں جو شہری رہ گئے تھے انہوں نے دستبرد و تحریک مزاحمت قائم کر کے جرمنوں کے خلاف تحریکی کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ برطانیہ کی سیکرٹ سروس نے سوچا کہ جن گوریلا پارٹیوں کو وہ فرانس میں اتارتے ہیں ان کے ساتھ وائلیس کا رابطہ ہوتا ہی نہیں اور اگر کسی پارٹی کے ساتھ ایسا انتظام ہو جائے تو یہ اتنا ناقص ہوتا ہے کہ جرمنی کی سیکرٹ سروس اس کا سراغ لگا لیتی ہے۔ اس رابطے کو بہتر بنانے کے لیے یہ سوچا گیا کہ گوریلا پارٹیوں کے ساتھ ایک عورت ریڈیو آپریٹر بھیجی جائے۔ اس تجربے کے لیے سب سے پہلے نور عنایت خان پر نظر پڑی۔ اس جوان سال خاتون میں ایک خوبی تو یہ بھی گئی تھی کہ وہ اردو، انگریزی، روسی اور جرمن زبان بولتی اور سمجھتی تھی۔ اُس میں یہ خوبی بھی تھی کہ بہت جلد بے تکلف ہوجاتی تھی۔ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ اس کی خوبصورتی اور شخصیت میں جو عیب و ظلال ہے اس سے کسی کو شک نہیں ہوگا کہ یہ انگریزوں کی بھیجی ہوئی تحریکی کار۔

اپریل ۱۹۴۲ء کے ایک روز اُسے حکم ملا کہ وہ ہٹلر دکنویریہ (لندن) کے فلاں نمبر کمرے میں پہنچے۔ وہ گئی۔ وہاں اُسے فوج کا ایک کپتان



ملا جس نے اُس کا انٹرویو لیا۔ اُس نے زیادہ تر سوال جو نور سے پوچھے وہ اس کی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ نور نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”میری جڑیں معلوم نہیں کہاں ہیں۔ کہیں ہیں بھی یا نہیں۔ مجھ پر ماں کی طرف سے امریکی اثرات بھی ہیں۔ میرا بچپن روسی ہے اور میری نوجوانی فرانسیسی۔ جذباتی لحاظ سے میری وابستگی ہندوستان کے ساتھ ہے جو شدید ہے۔“

یہ انگریز کپتان اُس کا انٹرویو لیتا رہا۔ بات جب وفاداری پر آئی تو نور نے بے تکلفی سے کہا۔ ”میں ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں سرگرمی سے شریک ہوں گی۔“

اس بے باک جواب نے کپتان کو بہت متاثر کیا۔ اُس نے رپورٹ میں لکھا کہ اس عورت پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس کی زبان اور دل کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ اس کی شخصیت گھٹی ہوئی اور کردار پختہ ہے۔ انگریز کپتان نے اُسے بتایا کہ اُسے جرمنوں کے خلاف کام کرنا پڑے گا۔ نور رضا مند ہو گئی۔ کپتان نے اُسے کہا کہ اگر وہ جرمنوں کی تنظیم ”گیٹاپو“ کے ہاتھ چڑھ گئی تو وہ اُسے ایسی اذیتیں دیں گے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی۔ نور عنایت خاں نے یہ خطرہ بھی

قبول کر لیا۔ اُسے رائل ایر فورس سے سبکدوش کر دیا گیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ نور کو فرانس بھیجا جائے تاکہ وہاں کی تحریک مزاحمت کے ساتھ خفیہ کام کرے اور ریڈیو ٹیلی گرافی کے ذریعے لندن کی سیکرٹ سروس کو وائرلیس پیغامات دیتی رہے۔ اُسے جب ایر فورس میں لیا گیا تھا تو اُسے ریڈیو ٹیلی گرافی کی ٹریننگ دی گئی تھی، مگر اُسے جب سیکرٹ سروس کے بڑے افسر کے سامنے لے جایا گیا تو اُس نے نور کا انٹرویو لے کر اُسے کہا کہ تم اس پر خطر کام کے لیے موزوں نہیں ہو۔ اُس نے کہا۔ ”میں نور! تم ادیب ہو اور تم بچوں کے پردگام کے لیے ہی موزوں ہو۔ جنگ کے بعد جب بچے دنیا کی تباہی دیکھیں گے تو تمہیں

ذہنی طور پر سنبھال لوگی۔ میرا خیال ہے تمہارا اصل کام جنگ کے بعد شروع ہوگا۔“

”مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں۔“ نور نے کہا۔ ”میں آج کے حالات کے لیے موزوں ہوں۔۔۔ پیرس میں۔“

اس افسر نے نیم دلی سے نور کو ٹریننگ کے لیے منتخب کر لیا۔ یہ بعد میں انکشاف ہوا تھا کہ نور اچھی طرح جانتی تھی کہ اُسے جن مشن کے لیے منتخب کیا جا رہا ہے وہ کیا ہے اور اس میں خطرے کیا ہیں۔ انگلستان میں سٹیفنس نام کا ایک آدمی ہے جو دوسری جنگ عظیم کا ہیرو کہلاتا ہے۔ اُس نے ساری دنیا میں برٹش سیکرٹ سروس کی انٹیلی جنس کا جال پھیلایا تھا۔ جنگ کے دوران فرانس میں جاسوسی اور تخریب کاری

اُسی کی ہدایت کاری سے کامیاب ہوئی تھی۔ (نوٹ فرمائیے کہ کتاب کے مصنف کا نام سٹیفنس ہے اور کتاب کے ہیرو کا نام سٹیفنس) ۱۹۳۷ میں نور عنایت خان ہندوستان میں اپنے والد کے

گھر سے دست نواب آف بھوپال کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ سٹیفنس انگلستان سے کسی سرکاری مشن پر ہندوستان آیا تھا۔ وہ نواب آف بھوپال کے ہاں شکار کھیلنے گیا۔ نور بھی ساتھ گئی۔ وہ شیر اور بڑے جانوروں کے شکار کی شوقین تھی۔ اُس وقت اُس کی عمر اسی سال تھی۔ اُس کی ملاقات سٹیفنس سے ہوئی۔ اُس نے نور کے متعلق یہ رائے دی تھی کہ لڑکی حیران کن حد تک خوبصورت ہے اور اس قدر معصوم کہ اس کے اخلاق اور کردار کو بگاڑا نہیں جاسکتا۔ اُس نے اُسی وقت دیکھ لیا تھا کہ اس لڑکی میں غیر معمولی صلاحیتیں ہیں۔

آٹھ سال بعد جب جنگ عظیم زدروں پر تھی سٹیفنس نے نور کی ضرورت محسوس کی۔ انگلستان میں اُس کا انٹرویو لیا گیا اور اُس کی ٹریننگ شروع ہو گئی۔ چند ماہ بعد اُسے فرانس بھیجنے کے لیے تیار کیا گیا۔ فرانس میں رہنے کے لیے اُس کا نام جین میری رکھ دیا گیا۔

سیکرٹ سروس میں استعمال کے لیے اُسے "میڈلن" نام دیا گیا۔ یہ اُس کی ایک کتاب کا عنوان تھا جس میں بچوں کی کہانیاں تھیں۔ اُس کے لیے پیرس کا راشن کارڈ اور شناختی کارڈ تیار کیا گیا۔ یہ کارڈ ہمارے جعل سازوں نے تیار کیے تھے۔ اس کے لیے کپڑے تیار کئے گئے جو ان دنوں فرانس میں عورتیں پہنتی تھیں۔ یہ خاص طور پر دیکھا گیا کہ اس لباس پر جو بٹن لگائے گئے ہیں وہ انگلستان کے بنے ہوئے نہیں فرانس کے بنے ہوئے ہیں۔ جاسوس عموماً انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے پکڑے جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی جاسوس دشمن کے ملک میں شک میں پکڑا گیا تو اُس کے خلاف کوئی قابل اعتبار شہادت نہ ملی۔ اُس کی جیب سے اپنے ملک کا بس کا ٹکٹ نکل آیا جس سے ثابت ہو گیا کہ یہ شخص فلاں ملک سے آیا ہے۔

نور عنایت خان کو لباس اور چلیے کے لحاظ سے اُس وقت کی فرانسیسی شہری بنا دیا گیا جب فرانس کا ہر شہری جرمنوں سے دُشمن زدہ رہتا اور راشن کی قلت محسوس کرتا تھا۔ فرانس میں اُسے کسی کے بچوں کی نرس کے بہروپ میں رہنا تھا۔ پھر اسے چار قسم کی گولیاں دی گئیں۔ ایک کا استعمال یہ تھا کہ وہ پکڑی جائے تو ایک گولی کپڑے والوں کی چائے کی پیالیوں میں ڈال دے۔ اس سے فوراً انسان بے ہوش کی نیند سو جاتا تھا۔ دوسری قسم کی گولیاں اپنی نیند اڑانے کے لیے تھیں۔ ان کی ضرورت ہنگامی حالات میں محسوس ہوتی تھی جب کام زیادہ اور نیند کا غلبہ ہوتا تھا۔ تیسری گولی اس مقصد کے لیے تھی کہ اگر کسی کو بیماری کا دھوکہ دینا ہو تو ایک گولی کھائی جاتی تھی۔ اس سے تھے شروع ہو جاتی تھیں۔ چوتھی اور خطرناک گولی خود کشی کے لیے تھی۔ ان گولیوں کے علاوہ اُسے ایک وائریس سیٹ (ٹرانسمیٹر) دیا گیا۔ یہ چھوٹے سائز کا تھا۔ نور کو زیادہ وزنی سامان نہ دیا گیا کیونکہ وہ قد آور اور تندرست عورت نہیں تھی۔ اُس کا قد پانچ فٹ تین

انچ اور وزن ایک من دس سیر تھا۔ نور (خفیہ نام میڈلن) کو اُس گوریلا تنظیم کے ساتھ کام کرنا تھا جس نے مقبوضہ فرانس کے بہت بڑے علاقے کو زرمیں لے رکھا تھا۔ اس کا خفیہ ہیڈ کوارٹر پیرس میں تھا اور اس کی پارٹیاں جنگوں اور سٹیبلز میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ پارٹیاں بجلی کے تار کاٹ کر بجلی کا نظام اور بجیم کر دیتی تھیں اور سائبرناٹھ (تباہ کاری) کرتی تھیں۔ اس تنظیم کی ضرورت کی فہرست بہت طویل ہوئی تھی جو خفیہ طریقے سے انگلستان سے پوری کی جاتی تھیں۔ اس تنظیم کی کارگزاریوں نے جرمنی کی سیکرٹ سروس کو پریشان کر دیا۔ فرانس میں جرمنی کے جاسوس ہر شہری کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے کپڑے دھو کر اور ظلم و تشدد میں اضافہ کر دیا۔ نور کو اس گوریلا تنظیم کی پارٹیوں کے درمیان دائرہ میں ٹیلی گرافی سے رابطہ قائم کرنا تھا اور فرانس سے لندن برٹش سیکرٹ سروس کو بھی اطلاعات اور معلومات پہنچانی تھیں۔

نور کو ریسرل اور امتحان کے بڑے ہی کچھن مرحلے سے گزارا گیا۔ اُسے "گیٹ پو" کی تفتیش کے امتحان میں سے بھی گزارا گیا جو یوں تھا کہ فرض کیا گیا کہ وہ پکڑی گئی ہے۔ اُس نے اپنے متعلق وہ جھوٹی کہانی سنائی جو اُسے ازبر کرائی گئی تھی۔ اُسے ایک کمرے میں بٹھا کر اُس کی آنکھوں کے قریب بہت تیز روشنی والے بلب لگا دیئے گئے۔ اُس کے سامنے چھ سیات آدمی کھڑے ہو گئے جنہوں نے اُس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ تفتیش کا یہ مرحلہ بڑا ہی اذیتناک ہوتا ہے۔ جرح درجرح اور آنکھوں کے بالکل قریب بلبوں کی تیز روشنی دماغ ماؤف کر دیتی ہے۔ مشتبه کی زبان اور عقل کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ نور کو کئی گھنٹے اس مرحلے میں رکھا گیا۔ آخر میں دیکھا گیا کہ وہ اپنی جھوٹی کہانی سے ذرہ بھر ادھر ادھر نہیں ہوتی۔

اُسے خفیہ (کوڈ) الفاظ بلکہ حروف یاد کرائے گئے۔ تین تین چارچار

حروف کا پورا جملہ بتاتا تھا۔ مثلاً بھنو۔ یو۔ اے کا مطلب یہ تھا —  
 ”ٹرا سمن بند کی جارہی ہے کیونکہ ارد گرد خطرہ ہے۔ اگر ممکن ہو تو  
 ٹرا سمن جاری رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔“ ایسے بہت سے  
 حروف کے مجموعے تھے۔ ان کے متعلق دشواری یہ تھی کہ نور انہیں  
 نوٹ کر کے اپنے پاس محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی۔ حروف کے مجموعوں  
 کی یہ طویل فہرست اُسے زبانی یاد کرنی تھی جو اُس نے کر لی۔ اس  
 کے علاوہ اُسے مختلف جگہوں کے ساتھ دائرے پر رابطہ قائم کرنے  
 کے طریقے بھی جو ایک دوسرے سے مختلف تھے زبانی یاد کرنے تھے۔ اُسے اپنے  
 دفاع میں چاقو استعمال کرنے کے طریقے بھی سکھائے گئے۔ بغیر چاقو  
 کے یعنی خالی ہاتھوں سے لڑنا اور اپنے دشمن کو بے کار کرنا بھی سکھایا  
 گیا۔ مثلاً اُسے سکھایا گیا کہ ہتھیلی تھوڑی کے نیچے اوپر کو مار کر دشمن کا  
 جڑا توڑا جاسکتا ہے۔ گھٹنے پیٹ میں کس طرح مار کر دشمن کو بیہوش  
 کیا جاسکتا ہے۔ ایسے کئی ایک داؤ سکھائے گئے۔  
 نور کو ہر پہلو سے تیار کر دیا گیا۔ اُس کی صرف یہ خامی سب کو  
 کھٹک رہی تھی کہ اُس کا حسن غیر معمولی تھا اور اُس کے جسم میں خوش  
 تھی اُسے دیکھ کر ہر کوئی ٹھٹھک جاتا تھا۔ اس لحاظ سے نور اپنے  
 آپ کو گنہگار نہیں رکھ سکتی تھی۔ ضرورت یہ تھی کہ وہ عام سی شکل و صورت  
 کی عورت ہوتی جس کی طرف کوئی دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا لیکن نور کے  
 جو دوسرے اوصاف تھے اور اُس کی جو صلاحیتیں تھیں وہ کسی اور  
 میں کم ہی دیکھنے میں آتی تھیں۔

ہو سکتا ہے قارئین اس سوچ میں پڑ جائیں کہ جاسوس عورتیں  
 عموماً اتنی خوبصورت ہوتی ہیں کہ دشمن کے اعلیٰ حکام کو اپنے حسن کے  
 جال میں الجھا کر اُن سے راز حاصل کر لیا کرتی ہیں۔ پھر نور کے حسن پر  
 کیوں اعتراض کیا گیا؟ مثلاً جنگ عظیم کے دوران مائتاہری نے  
 بہت شہرت حاصل کی تھی۔ کہتے ہیں وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اُسے

سزائے موت سنانے والے افسر کی زبان کا نپ رہی تھی لیکن مائتاہری  
 اور نور عنایت خان کے فرائض میں فرق تھا۔ نور کے مشن کی نوعیت  
 ایسی تھی جو اُسے چھپ کر کرنے تھے جب کہ مائتاہری کو سوشل اور  
 ملٹری حلقوں میں معزز عورت کے رُوپ میں گھومنا پھرنے اور اعلیٰ  
 حکام سے دوستانہ گانگھنا تھا۔ نور کو خاص طور پر احتیاط کرنی تھی  
 کہ اس کے ساتھ کوئی دوستانہ گانگھنے کی کوشش نہ کرے۔

وہ لمحہ آگیا جب نور کو موت کے اس سفر پر روانہ ہونا تھا۔  
 رات کے وقت اُسے پرانے دور کے ایک سٹ رفیارتھیا سے  
 ”لائسنڈر“ پر جانا تھا۔ اس طیارے کی دو ہی سیٹیں تھیں۔ ایک  
 پائلٹ کے لیے دوسری مینیجر کے لیے۔ اس طیارے کو فرانس کے  
 اہم ویران علاقے میں اترنا، نور کو امانا اور فوراً اڑانا تھا۔ فرانس کی گورنل  
 تنظیم اور وہاں کی ”تحریک مزاحمت“ کو خفیہ ذرائع سے بتا دیا گیا تھا کہ  
 عورت آرہی ہے۔ ”تحریک مزاحمت“ نے حکمت ہی تھی جہاں طیارے  
 کو امانا تھا۔ یہ پیش نظر رکھیے کہ ”لائسنڈر“ کے اترنے اور اڑنے کے لیے  
 کسی لمبے چوڑے رن وے کی ضرورت نہیں تھی۔ تین سو گز لمبا میدان  
 کافی تھا۔ یہ چھوٹا سا سٹ رفیارتھیا تھا۔

روانگی کے وقت برطانیہ کے ریڈیو، بی۔ بی۔ سی، نے اپنے ایک  
 پروگرام کے دوران اعلان کیا — ”یاسمین ہنسری بجا رہی ہے۔“  
 فرانس میں ”تحریک مزاحمت“ کے خفیہ اڈے نے یہ اعلان اپنے  
 ریڈیو پر سنا اور ”میڈلین“ (نور) کے استقبال کے لیے تیار ہو گئے۔ بی۔ بی۔ سی  
 نے اشارہ دے دیا تھا۔

آخری رات نور نے اپنے آپ کو اور ان اشارہ کو جو وہ ساتھ لے  
 جا رہی تھی، اچھی طرح دیکھا۔ اُس نے اپنے بیگ میں ۰۳۸ رول اور  
 ڈال رکھا تھا جو اُسے فرانس پہنچ کر کہیں چھپا دینا تھا۔ اُسے ایک پرائیوٹ

نے مخبری کر دی تھی جس کے نتیجے میں جرمن سیکرٹ سروس شدت سے سرگرم ہو گئی۔ اس کا ایک ثبوت تو نور کو فرانس میں اترنے ہی نظر آگیا۔ نوجوان پائلٹ نے بڑی مہارت اور دلیری سے طیارہ فرانس میں اس جگہ اتار دیا جہاں اتارنا تھا۔ انجن چلتا رہا۔ نور خاموشی سے اتری پائلٹ نے ایک لمحہ بھی انتظار نہ کیا، طیارہ دوڑا دیا اور زمین سے اٹھالے گیا۔ یہ ایسی جگہ تھا جہاں جرمنوں کی فوج نہیں تھی پھر بھی وہاں رکا نہیں جاسکتا تھا۔ نور نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں اس کے استقبال کے لیے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ — یہ ۱۲ جون ۱۹۴۳ء کی سحر تھی۔

نور کو خطرے کی بومحسوس ہوتی۔ وہ زیادہ دیر رکی نہیں۔ اُسے بتا دیا گیا تھا کہ استقبال کے لیے کوئی نہ آئے تو وہ کہاں جائے۔ وہ قریبی ریلوے سٹیشن گئی اور ریل گاڑی سے پیرس چلی گئی۔ اُسے ایسی گری نام کے ایک آدمی کا پتہ دیا گیا تھا جو ”تحریک مزاحمت“ کے اس سیکرٹ کارکناندر تھا۔ نور اُس کے گھر پہنچی تو وہ اُسے ایک پروفیسر کے پاس لے گیا۔ پروفیسر نے پودوں کی زمری میں ایک وائلیس سیٹ چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ نور نے اس سیٹ سے لندن کو خفیہ حروف کا پیغام بھیجا اور بتایا کہ وہ صبح ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ لندن والوں کے انتظامات بڑے اچھے تھے۔ پروفیسر کو یہ بھی معلوم تھا کہ نور کا سامان اور ٹرانسمیٹر بذریعہ پیراشوٹ پھینکے جائیں گے۔ دو ہی روز بعد ایک فارم میں رات کے وقت ایک طیارہ سامان پھینک گیا جس میں نور کے تین ٹرانسمیٹر تھے۔ یہ سامان رات کو ہی اٹھا کر ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا۔

اُسی روز کینیڈا کے وہ دو جاسوس جو چند ہی روز پہلے فرانس میں اتارے گئے تھے پکڑے گئے۔ وہ یونی روویلا نام کی اُس عورت کے ساتھ تھے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہ تینوں کہیں جا رہے تھے۔ ایک موٹر مڑے تو آگے سڑک پر چند اشیاء رکھ کر سڑک بند کی گئی تھی۔ تینوں سمجھ گئے کہ یہ انہیں پکڑنے کا اہتمام ہے۔ انہوں نے گاڑی روکی

بھی ساتھ لے جانا تھا تاکہ طیارہ کسی وجہ سے اتر نہ سکے تو فوراً اسٹوٹ کے ذریعے اتر جائے۔ .... نصف شب کے بعد دو بجے اُس کتے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ ایک جانے پہچانے آدمی نے کہا — ”جانے کا وقت ہو گیا ہے“۔ وہ تیار بیٹھی تھی۔ اُس کے ساتھ چلی گئی۔ اُسے بتایا گیا کہ اُس کا سامان اور ریڈیو ٹرانسمیٹر پیراشوٹ کے ذریعے بعد میں پھینکا جائے گا۔

چاند پورا تھا۔ نور ایک جگہ پہنچی جہاں ”لانسڈر“ طیارہ کھڑا تھا۔ اُس کے پائلٹ کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اُسے طیارہ ڈھن کے پیٹ میں اتارنا تھا۔ نور طیارے میں بیٹھی تھی۔ انجن شارٹ ہوا۔ طیارہ چلا اور ذرا ہی دیر بعد زمین سے اٹھ گیا۔ فرانس میں جرمن سیکرٹ سروس نے ایسا جال پھیلا دیا تھا جسے دیکھ کر بھی کہا جاسکتا تھا کہ نور عنایت خان یقینی موت کے منہ میں جا رہی ہے۔ اُن دنوں فرانس سے جو اطلاعات آرہی تھیں وہ اچھی نہیں تھیں۔ ”تحریک مزاحمت“ نے برطانیہ کی سیکرٹ سروس کو خبردار کیا تھا کہ اگلی اطلاع تک فرانس میں نہ کسی آدمی کو اتاریں نہ کوئی سامان بھیجیں کیونکہ جرمن سیکرٹ سروس اُن جگہوں کے ارد گرد سرگرم ہو گئی ہے جہاں سامان اور انسان اتارے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود انگلستان سے سامان اتارا جاتا رہا اور کینیڈا کے دو جاسوس بھی اتارے گئے۔

بعد میں تحقیقات ہوئی تھی کہ یہ وارننگ ملنے کے باوجود نور کو کیوں اور کس کے حکم پر بھیجا گیا تھا چونکہ خفیہ کارروائیوں کے متعلق تحقیقات بھی خفیہ رہی گئی اس لیے پتہ نہ چل سکا کہ تحقیقات کے نتائج کیا تھے۔ صرف یہ پتہ چل سکا کہ گوریل تنظیم نے پیغام بھیجا تھا کہ ایک وائلیس اپریٹر کو فوراً بھیجو۔ بہر حال یہ شہادت مل گئی کہ گوریل تنظیم اور ”تحریک مزاحمت“ کے ساتھ غداری ہو گئی تھی۔ اُن کے اپنے ہی کسی ساتھی



سیکڑ میں میرے سوا اور کوئی نہیں رہا جو یہاں کئی اطلاعات دے

سکے میں یہاں کے بچے کچھ آدھیوں کو کجا کرنے کی گوشش کر رہی ہیں تاکہ ایک رنگ تیار ہو جائے۔“

برطانیہ کی سیکرٹ سروس کا اعلیٰ افسر نور کو بریت پر واپس بلانے کا فیصلہ کیے ہوئے تھا۔ وہ کہتا تھا کہ نور کسی بھی روز گرفتار ہو جائے گی۔ فرانس میں اب گرفتاری، اذیت اور موت کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ اُس نے نور کو ایک اور وارلیس پیغام دیا جس میں کہا کہ تم واپس نہیں آنا چاہتی تو پیغام دینے چھوڑ دو کیونکہ تمہارے ٹرانسپورٹ کار سرائے لگانے کے لیے جرمین نے تمام تر سائنسی اور انسانی ذرائع تمہارے پیچھے ڈال رکھے ہیں۔ وہ تمہاری ٹرانسیشن مین رہے ہیں، مگر نور نے اپنے فرض میں کوتاہی گوارا نہ کی۔ جہاں اُسے کچھ معلوم ہوا اُس نے لندن کو پیغام دے دیا۔

پہلے خاما عرصہ پیرس میں رہی تھی اس لیے وہ چونکہ جنگ سے اپنے اُس وقت کے جاننے والوں کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اُسے ایک سکول ٹیچر مل گئی جو اُسے اپنے گھر لے گئی۔ اس سکول ٹیچر کی وساطت سے اُسے چند اور سہیلیاں مل گئیں۔ وہ ہر ایک کے گھر میں دو دو چار چار روز کے لیے مہمان ٹھہری۔ اُس کے پاس بائسکل تھی اور چھوٹا سا ایک ایچی کیس۔ کوئی بھی شک نہیں کر سکتا تھا کہ معمولی سے اس ایچی کیس میں نور نے ایک ٹرانسمیٹر اس طریقے سے چھپا رکھا ہے کہ کوئی اس کی تلاشی لے تو بھی ٹرانسمیٹر نہ پکڑا جائے۔ نور اپنی جس بھی سہیلی کے ہاں ٹھہری اُسے اپنی اصلیت نہ بتائی۔ رات کو جب اُس کے میزبان سو جاتے تو وہ پیغام نشر کرتی تھی۔

اُس نے چار ماہ اسی طرح جگہ جگہ کر کے اپنا فرض ادا کیا اور جنگ کے بعد جب جرمنی نے ہتھیار ڈالے اور جرمن سیکرٹ سروس کے سربراہان

نہیں۔ رکاوٹ سے ٹکرامار کر راستہ صاف کیا اور رفتار بڑھا دی کبیر سے جرمینوں کی ایک فوجی کار نکلی جو ان کے تعاقب میں گئی۔ کار میں سے فائرنگ ہوتی۔ روڈ دیر زخمی ہو کر اپنی گاڑی سے نیچے آ پڑی۔ اُس کے ساتھ بھی پکڑے گئے۔ روڈ دیر کو دو جرمین فوجیوں نے رائلٹوں کے جھٹوں سے پٹینا شروع کر دیا۔ روڈ دیر نے ریلوے ریلنگالا اور دونوں کو گولیوں کا نشانہ بنالیا، پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔ اُسے بہت اذیتیں دی گئیں لیکن اُس نے کچھ نہ بتایا۔ وہ جب ہڈیوں کا ڈھانچہ رگھو گئی تو اُسے گیس چیمبر میں داخل کر کے گیس چھوڑ دی گئی۔ اُس کے ساتھیوں کا انجناہ بھی اسی جیسا ہوا۔

جو پروفیسر فورڈ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا وہ دس روز بعد کراڈاگے۔ اس کے فوراً بعد ”تحریک مزاحمت“ کے بہت سے ہمرگرم رکن پکڑے گئے۔ اس کے ساتھ ہی لندن میں یہ پیغام پہنچا کہ فرانس میں زمین دوز تنظیم مکمل طور پر ختم ہو گئی ہے۔ اس کے تمام افراد جرمنوں کی بے رحمی میں تھے۔ یہ تنظیم فعال اور موثر تھی۔ ٹرانسمیٹر جو اس تنظیم کے پاس تھے وہ جرمنوں نے قبضے میں لے لیے تھے۔ صرف ایک ٹرانسمیٹر تھا جو بیانات نشر کر رہا تھا۔ یہ نور کا تھا۔ یہ نور ہی تھی جس نے برطانیہ کی سیکرٹ سروس کو اطلاع دی تھی کہ اُن کا سب سے بڑا اننگ جرمنوں نے توڑ دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جرمن سیکرٹ سروس کا کیا ہو گئی تھی اور اس خفیہ جنگ میں برطانیہ کو شکست فاش ہوئی تھی۔ اب وہاں کسی بھی زمین دوز کارکن کا محفوظ رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔

برٹش سیکرٹ سروس نے نور کو دائر لیس پر کوڈ میں یہ پیغام دیا کہ فلاں جگہ ایک طیارہ اترے گا۔ اُس سے واپس انگلستان آ جاؤ۔ یہ انگریز افسروں کی دانشمندی تھی کہ وہ نور جیسی قیمتی عورت کو جرمینوں کے ہاتھوں چڑھنے سے بچانا چاہتے تھے۔

”نہیں۔“ نور عنایت خان نے پیغام کا جواب دیا۔ ”پیرس

اور سامان بھی بکھرا ہوا ملا۔ دیہاتیوں نے جرموں کو تباہ کیا کہ یہ سامان بھیجے آیا ہے اور جن کے پیراشوٹ پڑے ہیں وہ آدمی کہاں ہیں۔ اسی دوران ”تحریک مزاحمت“ کا ایک لیڈر جو جبل خانے میں قید تھا اذیتوں اور قید سے تنگ آ گیا تھا اور اُس پر دہشت کا بھی غلبہ تھا، اُس نے یہ راز اُگل دیا کہ برطانیہ کے حلیائے گوریلا تنظیم اور ”تحریک مزاحمت“ کے لیے سامان کس کس جگہ بھیجتے ہیں۔ اُس نے وہ نقشے بھی اپنے گھر سے نکال کر دے دیے جن پر نشان لگے ہوئے تھے۔ ایک نشان اُن جگہوں پر تھے جہاں گوریلوں نے تباہی پائی تھی۔ ان میں گولہ بارود کے ذخیرے تھے اور فوج کے دیگر سامان کے ٹکڑے وغیرہ بھی تھے۔ دوسری قسم کے نشان اُن جگہوں پر تھے جہاں سبوتاژ کرنا تھا۔ اس لیڈر نے میڈلن (نور) کی بھی نشاندہی کر دی۔

برطانیہ اور جرمنی، دونوں کی سیکرٹ سروسیں حیران تھیں کہ نقاب اُٹھ جانے اور تنظیم ٹوٹ جانے کے باوجود نور کا ٹرانسمیٹ پیغامات نشر کرتا رہا اور وہ ”تحریک مزاحمت“ کے کبھرے ہوئے اور چھپے ہوئے افراد کو گواہ کرنے کی کوشش میں مگن رہی۔ اُس نے سوسائٹی کے اونچے درجے کے چند ایک افراد کا تعاون حاصل کر لیا۔ ان میں ایک ریڈیو بنانے والی قسم کا ڈاکٹر تھا۔ یہ آدمی نور کے ٹرانسمیٹر کی مرمت اور سرویسنگ کرا دیا کرتا تھا۔ ایک ڈاکٹر تھا اور چند ایک اونچے درجے کے کاروباری لوگ۔ نور ان میں سے کسی نہ کسی کے غفلت نے کوڑا سمیشن کے لیے استعمال کیا کرتی تھی۔ آخر میں اُس نے اپنی جائے پناہ ایک ڈاکٹر کے گھر کو بنالیا۔ ان تمام لوگوں نے اُسے پوری دیانتداری اور حب الوطنی کے جذبے سے تعاون دیا۔

نور نے اس ڈاکٹر کا ٹیلیفون استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جرمنی کے سرانگرساں ایک فون نمبر کی باتیں ٹیپ کر رہے تھے جو انہیں مشکوک معلوم ہوتی تھیں۔ ایک روز انہوں نے اس گھر پر چھاپہ مارا۔ انہوں نے ایک غیر معمولی خوبصورت لڑکی کو عین اُس وقت گرفتار کر لیا جب

کپڑے گئے تو انہوں نے زبانی اور تحریری ریکارڈ دکھا کر بھی بتایا کہ اس لڑکی نے ایسے ایسے خطرے مول لیے تھے جن سے سیکرٹ سروس کے تجربہ کار افسر بھی دنگ رہ گئے تھے۔ مرد بھی ایسی غیر معمولی دلیری کے مظاہرہوں سے گھبراتے ہیں۔ جرمن سرانگرساں کو یہ سراغ مل گیا تھا کہ جس کے ریڈیو ٹیلیگراف پیغام اُن کے آلات میں سنے جاتے ہیں اُس کا نام میڈلن ہے لیکن یہ سراغ نہیں ملتا کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے۔ اگر کسی جگہ کی نشاندہی ہو بھی جاتی تو وہاں میڈلن نہیں ہوتی تھی۔ میڈلن کے شک میں جرموں نے کسی عورتوں کو کپڑا۔ اُن کے ساتھ درندہ دل جیسا سلوک کیا۔ اذیتوں کی آخری حد آزمائی مگر میڈلن نہ ملی۔

نور عنایت خان سے ایک غلطی ہو گئی۔ اُس نے ”تحریک مزاحمت“ کے چند ایک افراد کو ڈھونڈ نکالا اور انہیں اپنا رول بتا کر انہیں نظم کرنے لگی۔ وہ جان نہ سکی کہ اب اس تحریک میں غدار اور مخبر بھی آ گئے ہیں۔ دیانتدار اور فرانس پر مرٹنے والے کارکن گرفتار ہو چکے تھے۔ ان میں سے کسی نے نور کے خلاف مخبری کر دی پھر بھی نور جرموں کے ہاتھ نہ آتی۔ جرموں نے ایک اور چال چلی۔ انہوں نے فرانس کے دیہاتی علاقوں میں اعلان کر دیا کہ ”تحریک مزاحمت“ کے جو افراد کپڑے جائیں گے اُن کے ساتھ جاسوسوں اور تخریب کاروں جیسا سلوک نہیں ہوگا بلکہ انہیں فرانس کی فوج کا سپاہی تصور کر کے نہیں جنگی قیدیوں کی حیثیت اور مراعات حاصل ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں گرفتاری کے فوراً بعد جنگی قیدیوں کے کیمپ میں بھیج دیا جائے گا۔

فرانسیسیوں نے دیکھ لیا تھا کہ جرمن سیکرٹ سروس کے چال سے اب کوئی بچ کر نہیں نکل سکتا، چنانچہ انہوں نے جنگی قیدیوں کی مراعات حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ دیہاتی علاقوں میں جرموں کو برطانوی ساخت کے پیراشوٹ اور کچھ

اُس کا ٹرانسمیٹر کھلا پڑا تھا۔ اس گھر میں چند اور آدمی تھے اور اُن کے سامنے ایک نقشہ پڑا تھا جس پر ایک جگہ نشان لگا ہوا تھا۔ یہ نشان زمین دوز سیوریج کے ایک مقام پر تھا۔ اس جگہ جرمنوں نے آبدوزوں کے لیے جدید قسم کے تارپیڈ ڈھچپا کر رکھے ہوئے تھے۔ یہ بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ یہاں سے جرمنوں نے سیوریج (پانی گزرنے کا زمین دوز راستہ جس میں گڑوں سے پانی گرتا ہے) کا پانی روک دیا تھا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ٹور کا کمال تھا کہ اس نے تارپیڈو بموں کے اس ذخیرے کا سراغ لگا لیا تھا۔ جس وقت جرمن سربراہانوں نے چھاپہ مارا اُس وقت ٹور لندن کو یہ پیغام دے چکی تھی کہ ”مارزی پین بارود و فلاں جگہ سپنیاؤ۔ بارود کی یہ قسم جسے ”مارزی پین“ کا نام دیا گیا تھا اس لیے بہتر سمجھا جاتا تھا کہ اس میں بارود والی بدبو نہیں بلکہ باداموں کے تیل جیسی خوشبو تھی۔ اس بارود سے ٹور جرمنوں کا زمین دوز تارپیڈو ذخیرہ تباہ کرنا چاہتی تھی۔

ٹور کو ایک پانچ منزلہ عمارت کی سب سے اوپر والی منزل کے ایک کمرے میں لے گئے۔ ابھی جرمنوں کو یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہی وہ میڈٹن ہے جسے وہ کئی مہینوں سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اُس کے خلاف جرم ثابت ہو چکا تھا۔ شہادت اور ثبوت مل گیا تھا۔ وہ جرم کرتے پکڑی گئی تھی۔ اُسے کہا گیا کہ اُس کے ساتھیوں نے اقبال جرم کر لیا ہے اور وہ بھی اقبال جرم کر کے اُن تمام سوالوں کے جواب دے دے جو اُس سے پوچھے جائیں۔ ٹور اُن کے جال میں نہ آئی۔ اس کی بجائے اُس نے اس کمرے سے فرار ہونے کی بڑی ہی دلیرانہ کوشش کی۔ اُسے اُس وقت کمرے میں کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ وہ اطمینان سے سوچ لے۔ وہ سیڑھیوں کے راستے نہیں بھاگ سکتی تھی کیونکہ وہاں فوج کا سپرہ تھا۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ پانچویں منزل کی کھڑکی میں سے نکل جائے گی۔

کچھ دیر بعد جرمن افسرانہ آئے تو ٹور وہاں نہیں تھی۔ اصرار دھر دیکھا وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ کسی نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو وہ کھڑکی سے دور دیوار کے ساتھ چپکی ہوئی نیچے اترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ذرا سی جگہ پائوں نے پاؤں جبار کھٹے تھے اور ایک جگہ ہاتھ بجائے ہوئے تھے۔ وہ اگر وہاں سے گر پڑتی تو مر جاتی مگر جرمن اُسے زندہ رکھنا چاہتے تھے ورنہ بہت سے راز اُس کے ساتھ ہی چلے جاتے۔ فوجی بھی حیران تھے کہ وہ وہاں تک کس طرح پہنچ گئی ہے۔ بڑی ہی مشکل سے اُسے پکڑا گیا۔

کمرے میں لاکر اُسے نفسیاتی لحاظ سے کمزور اور بے بس کرنے کی کوشش کی گئی مگر ناکام رہے۔ پھر جہانی اذیتوں کا مرحلہ آیا۔ ٹور نے خودکشی کا ارادہ کیا لیکن خودکشی کے لیے لندن سے اُسے جو گولی دی گئی تھی وہ اُس کے بیگ میں رہ گئی تھی۔ یہ بیگ جرمنوں کے قبضے میں تھا۔ جرمن سربراہانوں اور باہرین نے یہ معلوم کر لیا کہ یہی میڈٹن ہے۔ انہوں نے اُس کے ساتھ نہایت اچھا سلوک شروع کر دیا بہت اچھا کھانا دینے لگے۔ اُسے عزت اور احترام سے رکھا اور اُسے کہا کہ وہ انگریزوں کے خلاف جاسوسی کرے یعنی جرمنوں کی جاسوس بن جائے۔ اُس نے صاف انکار کر دیا۔

اذیتیں نئے سرے سے شروع ہو گئیں۔ ایک روز اسی عمارت کے اسی کمرے میں اُس کے دو ساتھیوں کو لاکر اُس کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ جرمنوں نے ان دو آدمیوں سے اقبال جرم کرایا تھا اور ان دونوں کو وہ اس مقصد کے لیے ٹور کے پاس لے آئے کہ اُسے اقبال جرم اور راز اُگلنے پر آمادہ کریں۔ جرمن باہر نکل گئے۔ ٹور نے ان دو آدمیوں کا قاتل ہونے کی بجائے انہیں فرار پر آمادہ کر لیا۔ تینوں کھڑکی میں سے نکل کر نیچے جانے کی بجائے دیوار کے ساتھ ٹھہریں پاؤں اور ہاتھ جاتے چھت پر چلے گئے۔ وہاں سے ساتھ والی عمارت کے چھت پر کود گئے جس کی ایک منزل کم تھی۔ وہاں سے بھی وہ نکل گئے مگر اس عمارت کے گرد فوج

کا اتنا پہرہ تھا کہ تینوں پکڑے گئے۔

ایک جرمن افسر سنس کیفر (سیکڑٹ سروس) نے برلن (جرمنی) کے دارالحکومت کو لکھا کہ یہ لوگ بہت خطرناک ہے۔ اس کی مراد اس کا کوئی ہیتر انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اسے ایک جیل خانے میں بھیج دیا گیا۔ جنگ ختم ہونے کے چار سال بعد (۵ اپریل ۱۹۴۹ء) کے روز حکومت برطانیہ نے اجازت دی کہ نور عنایت خان کی کہانی سنادی جائے۔ اس سے پہلے اسے خفیہ رکھا گیا تھا۔ جرمن افسر سنس کیفر کو جنگ کے بعد جنگی مجرموں کے ساتھ مزائے موت دی گئی تھی۔ اس نے مرنے سے پہلے نور کی کہانی سنائی تھی۔ سیکڑٹ سروس کے چند اور جرمن افسروں اور کاغذات سے بھی بہت سی معلومات ملیں جن سے نور کی داستانِ شجاعت مکمل کی گئی۔

حکومت برطانیہ نے ۵ اپریل ۱۹۴۹ء کے روز اپنے اخباروں کو یہ خبر دی کہ اس مسلمان عورت کو غیر معمولی بہادری اور فرض شناسی کے صلے میں برطانیہ کا دوسرا بڑا تمغہ جو فوجیوں کے لیے ہے دیا گیا تھا۔ اسے ”جارج کراس“ کہتے ہیں۔ فوجیوں کو ”وکٹوریہ کراس“ دیا جاتا ہے۔ اس خبر کے ساتھ اخباروں میں نور کی مختصر سی داستان بھی شائع ہوئی۔ اس میں یہ بتایا گیا کہ نور کو ”خاص طور پر خطرناک“ مجرم قرار دے کر جرمنی کے ایک بڑے ہی سخت جیل خانے میں رکھا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ بھی زنجیروں میں باندھ دیئے گئے اور پاؤں بھی۔ اسے مرد کھانا کھلاتے اور وہی اسے بیت الخلا میں لے جاتے اور اسے صاف کرتے تھے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۴ء کی صبح اسے گولی مار دی گئی۔

## وہ ترکوں کے خلاف نہ لڑے

پاکستان میں ہر جگہ خصوصاً علاقہ پوٹھوہار میں ترکوں کا نام احترام و عقیدت سے لیا جاتا ہے۔ پوٹھوہار میں ابھی تک چند بزرگ زندہ ہیں جنہوں نے پہلی جنگ عظیم ۱۸-۱۹۱۴ء میں ترکوں کو انگریزوں کے خلاف لڑتے دیکھا تھا۔ یہ بزرگ سلطان سی ہند کی فوج کے سپاہی تھے اور یورپی محاذ پر لڑے تھے۔ وہ ترکوں کی شجاعت کے قصے جھوم جھوم کر سناتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں عقیدت کے آنسو چھلکنے لگتے ہیں۔

پاک ترک دوستی کا بھرپور مظاہرہ گوجرہ خان (علاقہ پوٹھوہار) کے ایک جرمن سپاہی لائسن و فعدار، راجہ مال خان، نے ۱۹۱۴ء میں یسوپوٹیمیا کے محاذ پر کیا تھا۔ اس کے رسالے کو ترکوں کے خلاف لڑنے کا حکم ملا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا اور سارے کا سارا سال گھوڑوں سے اتر آیا۔ جنگ عظیم کے اس ڈرامائی واقعہ کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ جنگ کی تاریخ لکھنے والوں نے اس کا کہیں ہلکا سا اشارہ ہی کیا ہے، حالانکہ یہ ایک سوار کی نہیں پورے تین سو سواروں کی داستان ہے جنہوں نے

شہنشاہِ عظم برطانیہ کی حکم عدولی کی تھی اور اس کے عوض انہیں سمندر میں ڈبو دینے کی سزا دی گئی تھی۔ انگریز کی کسی کتاب میں ذکر ہونا ہو، پوٹھوہار کے مسلمانوں کے سینوں میں یہ داستان زندہ ہے اور زندہ ہی رہے گی۔ چند ہی برس گزرے راجہ مال خان فوت ہو گئے ہیں۔ لال خان فوت



ہوتے، ان کی کہانی فزت نہیں ہوتی، فوت ہو ہی نہیں سکتی۔

پہلی جنگ عظیم عروج پر تھی۔ ترک میدان میں اتر چکے تھے اور ان کے سامنے انگریزوں کے قدم اکھڑ رہے تھے۔ ترکوں نے سنگین زنی کے وہ مظاہرے کئے جسے ایک دُنیا نے خراج تحسین پیش کیا۔ وہ راتفلوں کے ساتھ لگی ہوئی سولہ انچ لمبی سنگین گورے سپاہیوں کے پیٹ میں مار کر انہیں اُپر اٹھاتا کر پیچھے پھینکتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ترک سپاہی مورچوں سے فائر کرنے سے دست بردست جھڑپ کو زیادہ پسند کرتے تھے اور وہ مسلسل کئی کئی روز ان جھڑپوں میں سنگین زنی کرتے تھے اور تھکان سے شل ہو جاتا کرتے تھے۔

انگریز کے پاس کٹوانے کے لئے غلام ہندوستان کی فوج تھی۔ اس فوج میں ہندوؤں اور سکھوں کے علاوہ مسلمان بھی تھے۔ انہیں بھی جرمنوں کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا۔ انگریزوں کو توقع تھی کہ ترکوں کی مختصر سی سپاہ کو برطانوی سپاہی بڑی آسانی سے سنبھال لیں گے، لیکن ترکوں نے انگریز کے خوابوں کو بالکل اسی طرح سنگینوں سے لہو لہان کر دیا جس طرح ستمبر کی جنگ میں پاکستانی غازیوں نے ہندوستانی سپینے اس کی دھرتی میں ریزہ ریزہ کئے تھے۔ پیش قدمی تو دور کی بات تھی، انگریز کے لئے تلک کر دفاعی جنگ لڑنا بھی محال ہو گیا تھا۔

ہندوستانی فوج ابھی جرمنوں کے خلاف استعمال کی جا رہی تھی اور غزنی محاذ پر جرمن سپاہیوں کا پلہ بھاری تھا اس محاذ پر علاقہ پونچھٹو مار کا رسالہ بھی لڑ رہا تھا ”جو گھڑوں کا رسالہ“ کہلاتا تھا لیکن اس کا نام کور آف گائیڈز کیوں لڑی تھا۔ اس کے سب سوار (تین ساڑھے تین سو) مسلمان تھے اور تحصیل گوجر خان کے رہنے والے۔ انگریزوں نے اس رسالے کو جرمنوں کے محاذ سے ہٹا کر میسوپوٹیمیا (عراق) کے محاذ پر ترکوں کے خلاف بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

جب ان مسلمان سواروں کو ترکوں کے خلاف لڑنے کا حکم دیا جانے

لگا تو رسالے کے انگریز کمانڈر نے غالباً یہ سوچا کہ مسلمان کو مسلمان کے خلاف لڑانا آسان نہیں، چنانچہ اُس نے تقریر شروع کر دی۔ پورا رسالہ اُس کے سامنے باقاعدہ صفوں میں گھوڑوں پر سوار کھڑا تھا۔ کمانڈر نے پہلے تو ترکوں کے خلاف زہرا گلا چھری ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ترک مسلمان ہی نہیں ہیں اور کہا۔ ”ہم ایسے دشمن کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں گے۔۔۔ جو انوار ترک تم سے زیادہ بہادر نہیں۔ تم انہیں ایک دن میں بھگا دو گے جس طرح تم نے جرمنوں کو بھگایا ہے۔ اب کوچ کی تیاری کرو۔“

تمام رسالے پر خاموشی طاری تھی کوئی گھوڑا بھی ہلکے سے کھڑ نہیں مار رہا تھا۔ جب کمانڈر نے رسالے کو کوچ کی تیاری کے لئے ”ڈسمس“ ہونے کا حکم دیا تو بھی رسالے پر خاموشی طاری رہی اور کوئی سوار ”ڈسمس“ نہ ہوا۔ گھوڑے جہاں کھڑے تھے کھڑے رہے۔ کمانڈر نے اب کے کمانڈروں کی طرح ”ڈسمس“ کا آرڈر دیا۔ سواروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اتنے میں پھلی صف سے ایک سوار نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا، لہکی سی ایڑ لگائی اور گھوڑا دو کی چال چلتا کمانڈر کے سامنے جاڑکا۔ سوار نے زین کے ساتھ بندھی ہوئی رائفل کھولی، گھوڑے سے اُترا، اپنا نیزہ (کریچ) (تلوار) اور رائفل کمانڈر کے گھوڑے کے سامنے پھینک کر سیلوٹ کیا۔

”حضور!“ سوار نے اپنے کمانڈر سے کہا۔ ”کسی اور محاذ پر بھیج دیں، ہم پہلے کی طرح جانیں لڑا دیں گے لیکن مسلمان ہوتے ہوئے مسلمان بھائی کے خلاف نہیں لڑیں گے ترک مسلمان ہیں اور ہمارے بھائی!“ اس سوار کا نام راجا لال خان تھا۔

پیشتر اس کے کہ کمانڈر کچھ کہتا سارے کے سارے سوار گھوڑوں سے اُتر آتے اور رائفلیں، نیزے اور کریچیں کمانڈر کے گھوڑے کے آگے ڈھیر کر دیں اور الگ جا کھڑے ہوتے۔ گھوڑے، سواروں کے بغیر، الگ کھڑے تھے۔ کمانڈر اور رسالے کے سکواڈرن کمانڈر بہت چیخے۔ گولی سے مار دینے کی دھمکیاں دیں لیکن مسلمان سوار چپ چاپ کھڑے رہے۔

جنگ میں اس قدر سنگین حکم عدولی کی سزا موت ہوتی ہے ساڑھے تین سو مسلمان سواروں کو سزائے موت دینا کچھ مشکل نہ تھا لیکن انگریز کو پتہ تھا کہ یہ خبر پھیل گئی تو پنجاب اور خصوصاً پونہٹو مار کے علاقے سے آئندہ برطانوی فوج کو کوئی سپاہی نہیں ملے گا۔

انگریز کے لئے مشکل اندر مشکل تھی۔ وہ ان سرکش مسلمانوں کو نہ معاف کر سکتا تھا نہ ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

رسالہ نہتہ تو ہو ہی چکا تھا۔ اسے پچھلے کیمپ میں کھلی نظر بندی میں رکھ کر اس پر گوروں کی ایک مسلح کمپنی کا پہرہ بٹھادیا گیا۔ سوار اجتماعی کورٹ مارشل کا انتظار کرنے لگے۔ سب کو یقین تھا کہ انہیں سزائے موت دی جائے گی، لیکن چند دنوں بعد یہ خلاف توقع اور حیران کن حکم آیا کہ تمام سواروں کو وطن واپس لے جا کر ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔

دوسرے ہی دن ان مسلمان سواروں کو ایک بندرگاہ پر لے جا کر ایک بوسیدہ سے بحری جہاز میں بٹھادیا گیا۔ یہ ایک دقتی نوعی قسم کا بہت ہی پُرانا اور ٹوٹا پھوٹا جہاز تھا۔ اس پر عملہ بھی ضرورت سے کم تھا۔ چنانچہ مسلمان سواروں کو اپنی سلامتی خطرے میں محسوس ہوتی۔ وہ جہاز سے اتر آتے۔ انہوں نے کہا کہ راستے میں خطرہ ہے کیونکہ یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ لہذا یہ تو ہمیں رات فلیس دے کر بھیجا جائے یا ہمارے ساتھ راتفلوں سے مسلح ایک کمپنی بھیجی جائے۔ انگریزوں نے بہت پس و پیش کی لیکن مسلمان کسی گہری سازش کے خطرے سے چوکتے ہوئے تھے اور وہ بندرگاہ پر ڈٹے رہے۔ آخر بڑی دقت سے ان کے ساتھ گورارہمنٹ کی ایک آدمی مسلح کمپنی بھیج دی گئی۔

رات کے وقت جہاز بندرگاہ سے نکلا اور سات آنٹھ روز کے عری سفر کے بعد ایک جگہ رُک گیا۔ سواروں نے دیکھا کہ دور دور تک ساحل کا نشان نہ تھا اور ہر طرف گہرا نیلا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ ان میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ دنیا کا کونسا حصہ ہے اور جہاز کیوں رُک گیا ہے۔ دو تین

دن گزر گئے اور جہاز رُک کارہا۔ سواروں نے دیکھا کہ ان کے ”محافظ“ گوسے اور جہاز ران بڑی بے چینی سے عرشے پر جا جا کر چاروں طرف سمندر کی وسعت کو متحسّس نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ سواروں کو شک سا ہوا اور انہوں نے کسی اُن جانے خطرے کے پیش نظر اپنے پہرہ دار مقرر کر دیتے جو رات بھر باری باری جاگتے تھے اور گوروں کی حرکات و سکنات دیکھتے رہتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ کوئی بات ضرور ہے۔

آٹھ روز گزر گئے تو جہاز کے عملے اور حفاظتی دستے میں بے چینی بڑھ گئی۔ اب تو ان کی ایک ایک بات اور ایک ایک حرکت سے غصہ اور بے چینی کا اظہار ہوتا تھا۔

وقت گزر رہا تھا اور جہاز میں راشن بھی ختم ہو رہا تھا۔ آخر سواروں نے جہاز رانوں اور حفاظتی دستے کے کمانڈر سے احتجاج کیا اور سختی سے پوچھا کہ جہاز کیوں رُک رہا ہے۔ جب انہیں کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا تو سواروں نے دھمکیاں دیں شروع کر دیں کہ وہ نہتے ہونے کے باوجود گوروں کو ختم کر دیں گے۔ مٹی بھر حفاظتی دستہ جو پیٹے ہی بے چین تھا اب گھبرانے بھی لگا۔

آخر جہاز نے لنگر اٹھا دیتے اور چند روز بعد وہ بمبئی کی بندرگاہ میں آگیا۔ تھوڑے دنوں کی نظر بندی کے بعد ان تمام سواروں کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ (اس سزا کو فوج کی دیہاتی زبان میں ”بارہ پتھر“ کہہ دینا کہتے ہیں)۔

پھر جنگ ختم ہو گئی اور بات نکلنے نکلنے نکل گئی۔ ان تین ساڑھے تین سو سواروں کے متعلق حکم آیا تھا کہ انہیں کسی پُرانے سے بحری جہاز پر بٹھا کر کہا جائے کہ انہیں وطن واپس بھیجا جا رہا ہے اور کھلے سمندر میں لے جا کر پیچھے پیچھے ایک جنگی جہاز بھیج دیا جائے جو توپوں سے اس جہاز کو سواروں سمیت غرق کر دے۔ اس کے لئے حفاظتی دستے اور جہاز رانوں کے علاوہ غرقابی سے پہلے لگانا ضروری تھا۔ چنانچہ جہاز پیٹے سے طے

روانگی کا حکم سنایا اور اُس نے غلطی سے یہ بھی کہہ دیا کہ رسالہ ترکوں کے خلاف لڑنے کے لئے جارہا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ مسلمان سواروں کے چہروں پر نمایاں تبدیلی آگئی۔ کمانڈر بھی سمجھ گیا کہ اُس کے حکم کی راہ میں مذہب حائل ہو گیا ہے۔ اُس نے پریڈر پر خاست کر دی لیکن مسلمان سواروں کو وہیں

روک لیا اور انہیں کہا: ”ہمیں معلوم ہے کہ انڈیا میں مذہب ہی تعصب بڑھ رہا ہے اور غلط قسم کے مذہبی جذبات کو ہوا دی جا رہی ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ ہمارے مسلمان سوار مذہب کے نام پر گمراہ نہیں ہوں گے اور شہنشاہ معظم کا حکم خندہ پیشانی سے بجا لائیں گے۔“

”کمانڈر نے دیکھا کہ مسلمانوں پر انوکھی سی خاموشی طاری تھی اور ان کے چہروں پر جو تبدیلی آگئی تھی وہ بھی انوکھی تھی۔ کمانڈر عتاب میں آگیا اور بولا: ”جو سوار ترکوں کے خلاف نہیں لڑنا چاہتا ایک قدم آگے آ جاتے، تمام مسلمان سوار ایک قدم آگے آگئے۔“

”ہمارا کمانڈر غصے میں آکر عظیم لغزش کر بیٹھا۔ اُس نے تہر آلود اور بُر نفرت لہجے میں کہا: ”تم مسلمان سوار بُزدل ہو۔ مذہب کی آٹلے کہ جنگ سے بھاگنا چاہتے ہو۔“

کیپٹن فریڈی گیسٹ حالانکہ تحریر میں متعصب ہے لیکن لکھتا ہے: — ”مسلمان سپاہی بُزدلی کے الزام کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ جو انگریز افسر مسلمان سپاہیوں کے ساتھ کچھ عرصہ رہے ہیں وہی اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمان سپاہی نے کبھی بُزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ دنیا کے بلا مبالغہ تمام ملکوں کے سپاہیوں میں جنگ کے لئے ہر لمحہ تیار رہنے والے صرف مسلمان ہیں۔ ان میں پنجابی اور چٹان خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ہمارے کمانڈر کا الزام بے بنیاد تھا۔“

فریڈی گیسٹ نے لکھا ہے: — ”کمانڈر کو جو انوں کی خاموشی سے تسلی ہو گئی کہ وہ مرعوب ہو گئے ہیں اور اب انہیں حکم عدولی کی جرات نہیں

کئے جوتے مقام پر جا کے ٹکرا رہا، لیکن نہ جانے کیا بات ہوتی کہ حفاظتی دستے اور جہاز رانوں کو کوئی جہاز سے نکلانے نہ آیا۔ کوئی جنگی جہاز بھی نہ پہنچ سکا اور سواروں کا جہاز بہت ہی آگیا۔

اس واقعہ کا ذکر کسی کتاب میں نہیں لیکن اس کا ثبوت ایسے ہی ایک واقعہ سے ملتا ہے جس کا تفصیلی ذکر ایک انگریز فوجی افسر کیپٹن فریڈی گیسٹ نے اپنی کتاب ”انڈین کیولری مین“

INDIAN CAVALRYMAN

میں کیا ہے۔ مصنف پہلی جنگ عظیم کے دوران ایک ہندوستانی رسالے کا افسر بن کے آیا تھا اور وہ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹-۴۵) تک برصغیر میں رہا۔ اس کی یہ کتاب اسی دور کا ایک رپورٹاژ ہے جو تعصب اور جانبداری سے بھرپور ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۹ء میں لندن میں چھپی تھی۔

فریڈی گیسٹ نے راجہ لال خان مرحوم کے واقعہ جیسا ایک واقعہ لکھا ہے جو زیادہ سنگین ہو گیا تھا۔ اس سے بالواسطہ تصدیق ہوتی ہے کہ مندرجہ بالا واقعہ من و عن صحیح ہے۔

فریڈی گیسٹ لکھتا ہے: — ”۱۹۱۴ء کے آخر میں میسوپوٹیمیا کے محاذ پر برطانوی افواج کی کیفیت تسلی بخش نہیں تھی۔ ترک ہمارے خلاف میدان میں آگئے تھے اور ان کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمارا رسالہ جھانسی میں مقیم تھا۔ اچانک حکم آگیا کہ رسالہ میسوپوٹیمیا کے لئے فوراً روانہ ہو جاتے۔ وہاں پہلے ایک ہندوستانی رسالہ موجود تھا جسے معلوم نہیں کیوں واپس ہندوستان بھیجا جا رہا تھا۔ ہمارے رسالے میں ہندو سکواڈرنوں کے ساتھ دو سکواڈرن مسلمانوں کے تھے۔ یہ خبر تو تمام دنیا میں پھیل گئی تھی کہ ترک برطانیہ کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں ترکوں کا خاص احترام تھا کیونکہ ترک مسلمان تھے۔ مسجدوں میں ہماری حکومت کے خلاف وعظ ہونے لگے اور ترکوں کی فتح کے لئے دعائیں مانگی جانے لگیں۔“

”ہمارے کمانڈر نے رسالے کو پریڈر پر بلا کر میسوپوٹیمیا کے لئے

وہ باہر آیا تو چاروں سواروں نے اُس پر راتفلوں سے نشانے باندھ لئے، لیکن کرنل بھانپ گیا کہ کوئی شدید قسم کی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اُس نے بڑے تھقل سے کہا۔ ”مجھے مارنے سے پہلے سوچ لو کہ میں مر گیا تو تمہاری شکایت سننے والا کوئی نہ رہے گا۔ پہلے اپنی شکایت بتاؤ۔“

”انہوں نے راتفلیں نیچے کر لیں اور ایک بولا۔ ”ہم ترکوں کے خلاف نہیں لڑیں گے۔“ دوسرے نے کہا۔ ”ٹرک ہمارے بھائی ہیں۔“ تیسرے نے کہا۔ ”ہم بزدل نہیں ہیں۔“ کمانڈر نے ہمیں بزدل کہا ہے۔ ”کرنل نے کہا۔ ”بس اب تم بارکول میں چلے جاؤ اور صبر سے کام لو۔“ لیکن چوتھے سوار نے راتفل تان کر کہا۔ ”یہ انگریز ہے، اس کی زبان پر اعتبار نہ کرو۔“

”... اور جب وہ نشانہ باندھ کر گولی چلانے لگا تو کرنل کا اردلی جو اتفاق سے مسلمان تھا کرنل کے سامنے آگیا۔ اُدھر گولی نکل چکی تھی جو اردلی کو ختم کر گئی اور کرنل بچ گیا۔... مسلمان سواروں کو شاید صدمہ ہوا ہوگا کہ اُن کا اپنا بھائی اُن کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ وہ خاموشی سے واپس چلے گئے اُدھر باقی مسلمان سواروں نے چھاؤنی میں ہر اس پھیلا رکھا تھا۔ یہ ایک مسلح بغاوت تھی جسے دبانے کے لئے برطانوی مشین گن بٹالین کو بلا لیا گیا۔“

فریڈی گیسٹ آخریں لکھتا ہے۔ ”جب چاروں سوار کرنل کے بنگلے سے نکلے تو کرنل نے تلوار نکال لی اور گھوڑے پر بیٹھ کر ان چاروں کا تعاقب کیا۔ چاروں بھاگ اُٹھے۔ ایک کو اُس نے تلوار سے ہلاک کیا، ایک کو گھوڑے تلے روندنا اور باقی دو گلیوں میں غائب ہو گئے۔... دوسرے روز مرے ہوئے دونوں باغیوں کی لاشوں کو تمام رسالے کے سامنے آگ لگا دی گئی اور یہ منظر مسلمان سواروں نے بھی دیکھا۔“

صاف پتہ چلتا ہے کہ برطانوی کیپٹن نے یہ آخری بڑا محض خفقت مٹانے کے لئے لکھا ہے۔ جن مسلمان سپاہیوں کے متعلق فریڈی گیسٹ نے خود تسلیم کر لیا ہے کہ ”مسلمان سپاہی بزدل نہیں ہوتا“ بھلا وہ سپاہی مسلح

ہوگی۔ اُس نے انہیں درخواست کر دیا اور مسلمان سوار نہایت خاموشی سے بارکول میں چلے گئے۔ ہم میں سے کوئی بھی نہ بھانپ سکا کہ ان کی یہ خاموشی کتنے بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔...

”... اگلے ہی روز مسلمان سوار اصطبل میں اپنے گھوڑوں سے ذرا پرے روزمرہ کی پریڈ کے لئے کھڑے تھے۔ دونوں سکواڈرنوں کے رسالدار بھی مسلمان تھے۔ وہ دونوں غائب تھے۔ اُن کا پریڈ پر موجود ہونا ضروری تھا۔ کمانڈر نے رسالداروں کو غائب پا کر غصے میں حکم دیا۔ ”اپنے اپنے گھوڑوں کے پاس کھڑے ہو جاؤ۔“ لیکن کوئی سوار اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ کمانڈر نے اپنا حکم دہرایا تو بھی کوئی جوان نہ ہلا۔ کمانڈر نے غصے میں آکر گالی دے دی۔ معاً اصطبل کے کسی گوشے سے دو مسلمان سوار نمودار ہوئے۔ اُن کے پاس راتفلیں تھیں۔ انہوں نے بیک وقت نشانہ باندھ کر کمانڈر پر گولیاں چلا دیں اور وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔...

”... قریب ہی ایک انگریز لیفٹیننٹ کھڑا تھا۔ اُس نے جست لگا کر ایک مسلح سوار کو دلوچ لیا لیکن ایک اور سوار نے راتفل کا بٹ لیفٹیننٹ کے سر پر ایسا مارا کہ وہ گرا اور مر گیا۔... میں آج بھی حیران ہوں کہ وہ لوگ راتفلیں کہاں سے لے آئے تھے کیونکہ راتفلیں کو توں میں بند تھیں اور پریڈ پر راتفلوں کی ضرورت نہیں تھی۔...

”ہندو افسروں کو بلا لیا گیا۔ وہ مسلمانوں سے ہتھیار رکھوانے کے لئے

چند ایک ہندو سواروں کو لے آئے لیکن مسلمان سواروں نے دونوں ہندو افسروں کو بھی جان سے مار دیا۔ اُس وقت پتہ چلا کہ صرف دو ہی نہیں کئی مسلمان سوار راتفلوں سے مسلح تھے اور وہ جانے کس طرح میگزین سے ایمونیشن بھی نکال لاتے تھے۔ وہ بے قابو ہو کر چھاؤنی کے علاقے میں چلے گئے۔ رات میں انہوں نے ایک اور انگریز افسر کو گولی مار دی۔...

”... ان میں سے چار سوار (جو اُس وقت پیاہ تھے) رسالے کے کمانڈنگ آفیسر (کرنل) کے بنگلے پر جا پہنچے اور اُسے لٹاکر باہر بلا لیا جب



ہو کر ایک آدمی کے آگے آگے بھاگ اُٹھے ہوں گے جو صرف ایک تلوار سے مسلح تھا! پھر جو مسلمان سپاہی ترکوں کے خلاف لڑنے پر اس قدر اگ بگولہ ہو گئے تھے وہ اپنے بھائیوں کی لاشوں کو جلتا چپ کر کے دیکھتے رہے ہوں گے! اگر دولاشوں کو جلتا ہے تب تک کی غیر قانونی اور فوجی قوانین کے خلاف حرکت کی گئی تو باقی باغیوں، کوکیوں بخش دیا گیا؟

سینہ بہ سینہ آتی ہوتی باتوں اور فریڈی گیسٹ کے اس تفصیلی بیان

سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس رسالے کو راجہ لال خان مرحوم کے رسالے کی جگہ بھیجا جا رہا تھا لیکن اس واقعہ کے بعد اس رسالے کو بھی میسورپوٹیمیا بھیجا گیا اور انگریزی حکومت کو تادیبی کارروائی کی بھی جرات نہ ہوتی کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا کیا خشر ہوگا۔

فریڈی گیسٹ کی ایک بات البتہ سمجھ میں آتی ہے۔ وہ لکھتا ہے —  
”اس ساری افسوسناک واردات کے دوران ہندو سوار بہت وفادار رہے اور انہوں نے مسلمانوں کی بغاوت کو دبانے میں بہت کام کیا۔“



پرچم اُٹا رہا

یکم جنوری ۱۹۱۵ء کے روز ایک ایسی فوج نے آسٹریلیا کے خلاف جنگ شروع کر دی جس میں صرف دو آدمی تھے۔ اُن کا جنگی سامان صرف اتنا سا تھا۔ دو رنگ آلور انٹلیں اور تقریباً ڈیڑھ سو راؤنڈ۔ اُن کی ٹرانسپورٹ آس کریم والی ریڑھی تھی جس کے آگے ایک بوڑھا گھوڑا جٹا ہوا تھا۔ دو آدمیوں کی اس فوج کا پرچم ایک میزکپش تھا جسے لال رنگ میں رنگ کر اس پر انہوں نے اپنے ہاتھوں چاند ستارہ بنایا تھا۔ یہ ترکی کا جھنڈا تھا

آسٹریلیا کے جنوب میں نیوساؤتھ ویلز کے چھوٹے سے قصبے بروکن ہل کے لوگ اپنے ساتھ رہنے والے دو مسلمانوں — گل محمد اور ملا عبد اللہ — کو افغان سمجھتے تھے کیونکہ اُن دونوں آسٹریلیا کے اس رگستانی علاقے میں سینکڑوں افغان شہر بان تھے۔ انہیں وہاں انگریز لے گئے تھے بعد میں انکشاف ہوا کہ گل محمد اور ملا عبد اللہ

ترک ہیں اور جذبہ حب الوطنی میں کٹھن بلکہ جنوبی وطن پرست ہیں۔ ترکی ۱۹۱۴ء میں ہی انگریزوں اور اُن کے اتحادیوں کے خلاف جنگ میں شریک ہو گیا تھا لیکن سفید ریش، ساٹھ سالہ گل محمد کو آسٹریلیا میں ۱۹۱۴ء کے آخری روز پتہ چلا کہ ترکی نے انگریزوں کے خلاف

جہاد کا اعلان کر دیا ہے۔ آسٹریلیا انگریزوں کی بادشاہی کا ملک تھا۔ گل محمد جوش جہاد اور سہجان سے کانپتا ہوا اپنے ترک ساتھی ملا عبد اللہ کے ہاں دوڑا گیا۔ ملا عبد اللہ جواں سال آدمی تھا اور بروکن ہل میں قصاب تھا۔ وہاں یہی دو ترک تھے۔ گل محمد نے ملا عبد اللہ کو بتایا کہ اعلان جہاد کا مطلب یہ ہے کہ ترک جہاں کہیں بھی ہیں وہ انگریزوں کے خلاف لڑیں۔ آسٹریلیا چونکہ انگریزوں کی مملکت تھی اس لیے ان دونوں ترکوں نے فیصلہ کر لیا کہ انہیں آسٹریلیا کے خلاف فوراً جنگ شروع کر دینی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے وہ صدیوں پرانی رانگھیں نکالیں جو انہوں نے کبھی شوقیہ خریدی تھیں۔ ان کے پاس چمچے کی تین پیٹیاں (بلیٹیں) تھیں۔ ہر ایک میں ایک سوراؤنڈ آسکتے تھے۔ انہوں نے تینوں بلیٹوں میں ڈیڑھ سوراؤنڈ اڑس لیے۔

میدان جنگ میں قومی پرچم کی ضرورت تھی۔ انہوں نے ایک میز پوش رنگ لیا اور اس پر چاند ستارہ بنالیا۔ اس کے ایک طرف بانس ڈال دیا۔ پرچم تیار ہو گیا۔ گل محمد آئس کریم بیچا کرتا تھا۔ اس کے لیے اس نے ایک ریڑھی بنا رکھی تھی جس کے آگے وہ گھوڑا جوت کر سارے قصبے میں گھوم بھیر کے آئس کریم بیچتا تھا۔ انہوں نے اسلحہ بارود ریڑھی میں رکھ لیا۔ اب وہ جنگ کے لیے تیار تھے۔

انہوں نے میدان جنگ کا انتخاب کر لیا۔ یہ جگہ قصبے سے دو میل دور کے گول اور گنبدنا ٹیلوں کے علاقے میں تھی۔ وہ اس جگہ چلے گئے اور مورچہ تیار کر لیا۔ قریب سے ریوے لائن گزرتی تھی۔ گل محمد اور ملا عبد اللہ دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد دشمن آگیا۔ یہ ایک مسافر گاڑی تھی جس میں زیادہ تر قصبے کے لوگ کنبوں سمیت سوار تھے۔ چونکہ وہ نئے سال کا پہلا دن تھا، اس لیے لوگ اجتماعی پکنک کے لیے جا رہے تھے۔ ان میں اکثریت کان کنوں اور ان کے بیوی بچوں کی تھی۔ وہ ہنستے اور گاتے ہوئے جا رہے تھے۔

بعض بچوں نے گاڑی کی کھڑکیوں میں سے آئس کریم کی ریڑھی دیکھ لی۔ یہ ان کی محبوب ریڑھی تھی۔ وہ تالیاں بجانے لگے۔ دونوں ترکوں نے فائر کھول دیا۔ پہلی دو گولیوں سے دو بچے مارے گئے۔ دوسری دو گولیوں سے ایک مرد اور ایک عورت کا خاتمہ ہو گیا۔ گولیوں سے کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ ان کے ٹکڑوں نے کئی مسافروں کو زخمی کر دیا۔ مسافروں نے چیخ و پکار کی۔ کسی نے زنجیر پھینچی اور گاڑی روک گئی۔ مسافر کھلبلی کی حالت میں گاڑی سے اترنے لگے۔

ریوے لائن کے قریب لوہے کے ایک کبس میں ریوے والوں کے استعمال کے لیے ٹیلیفون لگا ہوا تھا۔ انجن کے فائر میں نے یہ کبس کھولا اور پولیس اسٹیشن کو اطلاع دی کہ گاڑی پر فائرنگ ہو رہی ہے اور کئی مسافر ہلاک اور زخمی ہو چکے ہیں۔ پولیس انسپکٹر ایڈورڈ برٹرنے یہ پیغام سنا تو وہ سمجھا کہ فون کرنے والا ریوے کا کوئی آدمی ہے جو بہت زیادہ شراب پی گیا ہے مگر فائر میں نے اسے کما کما جہاں سے فائر آ رہا ہے وہاں ایک جھنڈا لہرا رہا ہے جس پر چاند اور ستارہ ہے اور وہاں آئس کریم کی گھوڑا ریڑھی بھی کھڑی ہے۔ انسپکٹر ایڈورڈ برٹرنے اس ریڑھی سے واقف تھا۔ وہ اس کے مالک گل محمد کو جانتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ آسٹریلیا میں بھی جنگ عظیم شروع ہو چکی ہے۔

انسپکٹر ایڈورڈ برٹرنے اچھل کے اٹھا اور قریب کے فوجی کیمپ میں جا کر بتایا کہ قصبے سے دو میل دور کیا ہو رہا ہے۔ اسے اس فوجی دیئے گئے۔ اس فورس میں اس نے اپنے بہت سے کانسیل شامل کر دیئے۔ فوج اور پولیس کی اس نفری کو فوراً میدان جنگ میں پہنچایا گیا مگر ترک وہ پوزیشن چھوڑ کر کچھ دور چٹانوں میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے اپنا پرچم ایک اونچی چٹان پر لگا دیا اور مورچہ بند ہو گئے۔ انہیں یقیناً احساس ہو گا کہ پولیس یا فوج آئے گی اور ان کی اصل جنگ

انہی کے ساتھ ہوگی۔ اس کے لیے انہوں نے چٹانی پوزیشن بہتر سمجھی۔  
فوج اور پولیس کے سپاہیوں نے چاند ستارے کا پرچم دکھا اور  
دہاں بہاں بول دیا مگر اُن کی خوش فہمی ترکوں کے فائر نے رفع کر دی۔

وہ نہایت کارگر فائر کر رہے تھے۔ بہاں بولنے والے رُک گئے اور ادھر  
اُدھر پھیل کر چٹانوں کی اوٹ میں جھکے ہوئے یا ریگتے ہوئے آگے  
بڑھنے لگے۔ دونوں ترکوں نے بھی سپاہی اوندھے کر دیئے۔ بہاں بولنے  
والے گالیاں دیتے اور کوسے ہوئے پیچھے ہٹ آئے۔

جب سامنے کا یہ حملہ ناکام رہا تو انسپکٹر ایڈورڈ ٹرنے پہلوؤں  
سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ خود ایک کانٹیل کو جس کا نام جیک بڑ  
تھا، ساتھ لے کر ترکوں کے عقب سے آگے بڑھا۔ دونوں دہے  
پاؤں بڑھتے گئے۔ فاصلہ دوسو گز رہ گیا تو ترکوں نے انہیں دکھ لیا۔  
ترکوں نے تین گولیاں فائر کیں۔ ایک گولی کانٹیل جیک بڑ کے پیٹ میں  
لگی۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر گرا اور تڑپنے لگا۔ دوسری گولی انسپکٹر  
ایڈورڈ ٹرن کی ران میں سے گز گئی اور اُس کی چھین لٹکنے لگی۔ دونوں  
زخمی بڑی مشکل سے ریگتے ہوئے پیچھے آ گئے۔

ریل گاڑی آگے جانے کی بجائے واپس بروکن ہل چلی گئی۔ سارے  
قصبے میں خبر پھیل گئی کہ گل محمد اور ملا عبداللہ نے ریل گاڑی پر فائرنگ  
کی ہے۔ کوئی بھی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ یہ دو بھلے مانس مسلمان  
”افغان“ ایسی خوفناک حرکت کر سکتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اُن کی  
بیویاں ملا عبداللہ قصاب سے گوشت لاتی ہیں اور ہمارے بچے  
گل محمد کی آس کریم کے شیدائی ہیں۔ دونوں غیر ملکی اور غیر مذہب کے  
آدمی قصبے کے ہر گھر کے فرد معلوم ہوتے تھے مگر جب ریل گاڑی  
سے اتار دی ہوئی لاشیں قصبے کے لوگوں نے دیکھیں تو سب غصے  
اور انتقام سے بھڑک اُٹھے۔ ہر وہ آدمی جس کے پاس رائفل تھی یا  
پستول تھا، مسلح ہو کر میدان جنگ کی طرف دوڑ پڑا۔

تھوڑی سی دیر میں ایک سو شہری جو رائفلوں اور پستولوں سے  
مسلح تھے اُس محاصرے میں شامل ہو گئے جو فوج اور پولیس نے  
دو ترکوں کے مورچے کا کر رکھا تھا۔ شہری دانت پیس پیس کر کہتے  
تھے کہ گل محمد اور ملا عبداللہ انہیں زندہ مل گئے تو وہ ان کا قیہ کر دیں گے  
مگر کسی کا قیہ کرنے سے پہلے اُسے پکڑنا ضروری ہوتا ہے۔ یہاں بھی  
مسئلہ تھا۔ دوسو سے کچھ زیادہ رائفلس ترکوں کے مورچے پر چاروں  
طرف سے مسلسل فائر کر رہی تھیں۔ جونہی کسی کا سر چٹان سے ذرا  
اُپر ہو جاتا ترکوں کی گولی آتی اور وہ سر فوراً غائب ہو جاتا یا لڑھک جاتا۔

اب ٹرک دیکھ کر اور تاک کر گولی چلاتے تھے۔ انہیں اندازہ ہو  
گیا تھا کہ وہ کتنی نفری کے محاصرے میں ہیں۔ انہوں نے بلند آواز  
جنگی ترانے گانے شروع کر دیئے۔ پھر وہ قرآن کی آیات پڑھنے لگے۔  
اُن کی آواز اتنی بلند تھی کہ رگستان میں دُور دُور تک سنائی دیتی تھی۔  
وہ نعرے بھی لگاتے تھے۔ اُن کے سروں پر چاند ستارے والا پرچم  
پھڑپھڑاتا تھا۔

مہینہ تو جنوری کا تھا لیکن دنیا کے اس خطے میں دن گرم ہو جاتے  
تھے۔ وہ رگستان تھا۔ محاصرہ کرنے والوں نے ترکوں کی آواز کی تبدیلی  
اندازہ کیا کہ وہ پیا سے ہیں اور ان کے پاس پانی نہیں۔ وہ چونکہ بلند آواز  
سے ترانے گاتے اور آیات پڑھتے تھے اس لیے سب سن رہے تھے۔  
پہلے اُن کی آواز میں تازگی تھی جو سورج کی گرمی بڑھنے کے بعد ختم ہو گئی۔  
اب اُن کی آوازیں پٹی پٹی تھیں مگر ان کی رائفلوں کی نالیاں تروتازہ تھیں۔  
اُن کی اگلی ہونی گولیاں ضائع نہیں جاتی تھیں۔ کوئی نہ کوئی آدمی ہلاک یا  
زخمی ضرور ہوتا تھا۔

ترکوں کے پرچم میں اتنی گولیاں لگی تھیں کہ اس کے چلتھڑے ایک  
آئے تھے مگر چاند ستارہ محفوظ تھا اور ہوا میں لہرا رہا تھا۔ پرچم کا بانس  
محفوظ تھا۔

صرف دو آدمیوں سے ہتھیار ڈالوانے اور انہیں پکڑنے کے لیے مزید ملک آگئی۔ یہ فوج نے بھیجی تھی۔ سب شہریوں میں بھی اضافہ ہو گیا اور اب حملے کا نیا طریقہ اختیار کیا گیا۔ پچاس بہترین نشانہ بازوں کو نیم دائرے میں پھیلا کر انہیں کہا گیا کہ وہ ترکوں کے موپے پرسل فائر کرتے رہیں تاکہ وہ سر نہ اٹھا سکیں۔ ایک سو آدمیوں کو حکم ملا کہ وہ پچاس رائفلوں کے کورنگ فائر کے نیچے رنگ کر ترکوں کے مورچے تک مختلف اطراف سے پہنچیں اور ان پر ٹوٹ پڑیں۔

یہ آپریشن شروع ہو گیا۔ گل محمد اور ملا عبد اللہ کے مورچے کے ارد گرد چٹانوں پر گولیوں کا ایندھن بھرا لگا۔ چٹانوں کے ریزے ارد گرد اڑنے لگے۔ اس فائر کے نیچے ایک سو آدمی بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ دیکھا گیا کہ ترکوں کے نعرے، ترانے اور آیات خاموش ہو گئیں اور ان کے فائر میں کمی بھی آنے لگی۔

آخر ایک سو آدمی دو آدمیوں کے مورچے پر جا پڑے۔ وہاں صرف ملا عبد اللہ زندہ تھا۔ گل محمد مرچکا تھا۔ پتہ چلا کہ اُسے چھ گولیاں لگی تھیں۔ ایک گولی اُس کے کندھے میں لگی تھی۔ یہ بازو بیکار ہو جانے کے بعد وہ ایک ہاتھ سے رائفلی فائر کرتا رہا تھا۔

ملا عبد اللہ کچھ دیر تک فائر نہیں کر سکا تھا کیونکہ ایک گولی نے اُس کے گال کی ہڈی توڑ دی تھی اور ایک گولی اُس کی کھوپڑی کی ہڈی کو اوپر سے کاٹتی گزر گئی تھی۔ دماغ محفوظ رہا اور ہڈی زیادہ نہ ٹوٹی۔ اُس کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اب وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ اُسے سٹریچر پر ڈال کر چٹانوں سے باہر لایا گیا۔ لوگ اسے دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ خطرہ تھا کہ وہ ملا عبد اللہ کی بوٹیاں نوچ لیں گے لیکن انہوں نے اُسے دیکھا اور پیچھے ہٹ گئے۔

وہ صرف پیچھے ہی نہ ہٹے بلکہ کئی آوازیں سنائی دیں بہت

سے لوگ ان دونوں ترکوں کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے کہ انہوں نے اپنے ملک کی آن کی خاطر ایک پوری قوم سے ٹکرائی اور اپنے پرچم کی خاطر جانیں دے دیں۔ لوگ ایک دوسرے کو ان کی مثال دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ حب الوطنی کا جذبہ ہو تو ایسا ہو۔

ملا عبد اللہ نے ہسپتال میں لیٹے لیٹے سرائٹھایا اور گال کی ہڈی ٹوٹ جانے کے باوجود جاندار آواز میں کہا: ”ہم دونوں کو خوشی تھی کہ ہم اپنے ملک کے لیے لڑ رہے تھے اور ہم زیادہ تر ہیں کہ اپنے ملک کے لیے مر رہے ہیں۔“ یہ اُس کے آخری الفاظ تھے۔ وہ دو تین منٹ بعد خدا نے حقیقی کے حضور پہنچ گیا۔ اُن کی رافلیں، تینوں خالی بیٹلیں، آئس کرم والی ریڑھی کا ایک پیٹہ اور اُن کا تار تار پرچم آج بھی نیو ساؤتھ ویلز کے پولیس کے عجائب گھر میں رکھا ہے۔





## ترکوں کی قید سے میرا فرار

۱۹۵۰ء کا ذکر ہے، ترکی کی فوج کا کمانڈر انچیف جنرل کاشقن پاکستان آیا۔ اُس وقت امریکہ کی قیادت میں برطانیہ، پاکستان، ترکی، ایران اور عراق کو ایک دفاعی اور ترقیاتی معاہدے میں لانے کی بات چیت ہو رہی تھی جو بعد میں بغداد پیکٹ اور چار سال بعد سینٹر (سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن) کے نام سے وجود میں آیا۔ میں اُس وقت میجر جنرل تھا اور ریٹائر ہونے والا تھا۔ آرمی سروس کوڑے مجھے کرنل کمانڈنٹ کا اعزاز دے رکھا تھا۔ یہ اعزاز متعلقہ محکمے کے باپ کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے دل میں ترکوں کی محبت بہت زیادہ ہے۔ میں نے جنرل کاشقن کے اعزاز میں آرمی سروس کوڑے چمک لالہ کے میس میں بہت بڑی دعوت دی۔ اس سے پہلے میں اس کانفرنس میں شرکت کر چکا تھا جس کے لیے ترکی کا یہ جنرل پاکستان میں آیا تھا۔

جنرل کاشقن کو دیکھتے ہی مجھے سینتیس سال پہلے کا دور یاد آ گیا جب پہلی جنگ عظیم شدت سے لڑی جا رہی تھی میں اُس وقت رسالے میں تھا۔ ہمارے بیشتر قارئین رسالے سے واقف نہیں ہوں گے۔ آج کل رسالے کو ٹینک رجمنٹ کہا جاتا ہے۔ پُرانے وقت کے فوجی ٹینک رجمنٹ کو اب بھی رسالہ (کیولری) کہتے ہیں۔ ٹینکوں اور کبوتر بند گاڑیوں سے پہلے رسالے میں گھوڑے بٹھاکرتے تھے جن کے سوار اُفٹوں، لمبی تلواروں اور برہمیوں سے مسلح ہوتے تھے۔ افسروں کے پاس تلوار اور ریلوے ہوتے تھے۔ منہایت تندرست اور توانا

گھوڑے ہوتے تھے۔ ان کی اپنی ہی شان تھی۔ جنرل کاشقن کو دیکھ کر مجھے اپنا گھوڑوں والا رسالہ یاد آ گیا جس کے ساتھ میں میسوپوٹیمیا میں پہلی جنگ عظیم میں شامل ہوا اور ہمارے بڑے مقابل ترک اور عرب تھے۔

۱۹۵۰ء میں جب جنرل کاشقن پاکستان میں آیا تو میں نے اُسے فوراً پہچان لیا اور اُس نے مجھے کئی بار ایسی نظروں سے دیکھا جن میں سوال اور شک سا تھا جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور جب میں نے اُسے چمک لالہ (راولپنڈی) میں ”آرمی سروس کور“ کے میس میں مدعو کیا تو وہاں اُس نے مجھ سے پوچھا ”آپ کافر نس کے دوران جب مجھ سے نظر ملاتے تھے تو آپ اس طرح مسکراتے تھے جیسے آپ مجھے جانتے ہیں۔ مجھے بھی کچھ ایسا شک ہو رہا ہے کہ ہم پہلے بھی کہیں ملے ہیں۔“

”جی ہاں۔ میں نے اُسے یاد دلایا۔“ ہماری پہلی ملاقات ۱۹۱۶ء میں عراق کے محاذ پر قلعہ شطرہ میں ہوئی تھی۔“

وہ مزید حیرت میں پڑ گیا۔ کہنے لگا ”قلعہ شطرہ پر تو ہمارا قبضہ تھا۔ ہم انگریزوں کے خلاف لڑے تھے۔ آپ انگریزوں کی فوج میں تھے پھر ہماری ملاقات وہاں کیسے ہو سکتی تھی؟“

”مجھے قلعہ شطرہ میں جنگی قیدی کی حیثیت سے آپ کے سامنے لے جایا گیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور میں آپ کی قید سے فرار ہوا تھا۔“ اُسے نکلخت سارا واقعہ یاد آ گیا۔ اُس نے کہا ”آپ اصرار تھے۔ آپ کی ٹانگ شدید زخمی تھی، مگر آپ فرار کیسے ہوئے؟ وہاں سے تو کوئی تندرست آدمی بھی نہیں بھاگ سکتا تھا۔ آپ زخمی ٹانگ سے کیسے بھاگے تھے؟“

”وہ میرا جوانی کا دور تھا۔“ میں نے کہا۔ ”میں اُس وقت لوہے کی زنجیر توڑ سکتا تھا۔ میرا قد دیکھئے ساڑھے چھ فٹ کے قریب ہے۔ میں آرمی کا اینٹیلیٹ تھا جس نے کئی ریکارڈ قائم کیے تھے۔ شطرہ قلعے کی بارہ فٹ اونچی دیوار پھلانگنا میرے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔“

میری قید اور فرار کی داستان اس طرح شروع ہوتی ہے کہ عراق میں ترکوں

اور عربوں نے انگریزوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ میرا رسالہ ۱۹۱۵ء میں بمبئی سے بحری جہاز میں بصرہ کے لیے روانہ ہوا۔ پانچ دنوں بعد جہاز شط العرب میں داخل ہوا۔ آگے دیکھا کہ ترکوں کے تین بحری جہاز دریا میں ڈوبے پڑے تھے اور آگے جانے کا راستہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ تین جہاز ترکوں نے انگریزوں کا راستہ روکنے کے لیے دریا میں خود ہی ڈبوئے ہیں۔ ہمارا جہاز نہایت آہستہ آہستہ پیچ در پیچ راستہ بناتا آگے نکل گیا اور ہمیں الف لیلا کا بصرہ نظر آنے لگا مگر وہاں کوئی گودی نہیں تھی۔ ہمیں حکم ملا کہ اپنا اپنا سامان سر پر اٹھا کر دریا میں اتر جاؤ۔ ہم نے حکم کی تعمیل کی اور گھٹنے گھٹنے پانی میں اتر گئے۔ گھوڑوں کو کرینوں سے اٹھا کر دریا میں پھینک دیا جاتا اور جوان انہیں پکڑ کر کنارے پر لے جاتے۔ اس انوکھے طریقے سے کئی گھوڑوں کو چوٹیں آئیں۔

ہم سارا دن اور ساری رات سامان اور گھوڑے اتارتے رہے اور کیمپ تک پہنچاتے رہے۔ تین چار دن تیاری میں صرف ہو گئے۔ ہمیں ابھی آگے جانا تھا۔ بصرہ سے گزنا، دریا کے کنارے ہمیں پیدل لے جایا گیا۔ گزنا سے ناصرہ تک کے لیے ہمیں بڑی دریائی کشتیوں پر جنہیں تکر کہا جاتا تھا، سوار کرایا گیا۔ ایک ایک دفعتی جہاز کے پیچھے چار سے چھ تکر باندھے گئے اور ہم جھیل الحما میں پہنچے۔ جھیل میں پانی کی کمی کی وجہ سے جہاز رستہ میں پھنس گیا۔ اسے نکلانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تو جہاز کے کپتان نے وائر لیس کے ذریعے مدد مانگی۔ رات کے وقت عربوں نے ہم پر فائر کھول دیا بہت دیر تک ہم پر گولیاں برستی رہیں لیکن پانی میں گرتی رہیں۔ اگلے دن ہم کشتیوں کو گھسیٹے رہے۔ ہماری مدد کے لیے ناصرہ سے دو گن بوٹیں آئیں لیکن ان کے لیے پانی تھوڑا تھا۔ ہم کشتیوں کو گھسیٹ کر ان تک پہنچے اور اس طرح کچھ ان کی مدد سے اور کچھ اپنی شفقت سے ہم ناصرہ پہنچ گئے۔

ناصرہ پر جو دریا تے فرات کے کنارے واقع ہے، پہلے ہی دو گورا اور چار ہندوستانی پلیٹین، ایک مونٹین توپ خانہ، ایک ہارس توپ خانہ،

ملاح عرب ہوتے تھے۔ رات کے وقت ہندوستانی سپاہی چینی فوٹ اور دودھ کے ڈبے جو انگریز افروں اور سپاہیوں کے لیے آتے تھے ہتھیروں میں سے چھڑا لاتے۔ اس میں کچھ عربی ملاحوں کو دے دیتے اور جب ہندوستانی اپنے کیمپوں میں پہنچ جاتے تو عربی ملاح اپنے حصے کا سامان ادھر ادھر چھپا کر پتھر، چور، کاشور بپا کر دیتے۔ انگریز افسر یہ سمجھتے کہ چوری کرنے والے عرب کے لوگ ہیں۔ راشن چوری کی وارداتیں یہاں تک بڑھ گئیں کہ انگریزوں کے لیے جو ڈنبے اور کبرے آتے تھے وہ بھی چوری ہونے لگے۔ ان کی کھالیں ادھر ادھر پڑی ملتی تھیں۔

راشن چوری کی وارداتیں اور ہندوستانی فوج کی ناگفتہ بہ حالت ایسے عروج پر پہنچ گئی کہ برطانیہ تک رپورٹ گئی۔ محکمہ جنگ نے ایک کشتن بھیجا جس نے فرنٹ پر جاکر اپنی آنکھوں کا م کو الٹ کا مشاہدہ کیا۔ تب ہندوستانی فوج کی قسمت کھلی۔ معلوم ہوا کہ کاغذات میں ہندوستانی سپاہیوں کو نہایت اچھا راشن اور دیگر سامان ملتا تھا مگر عملاً فاقہ کشی تھی۔ کشتن کی رپورٹ پر ہندوستانیوں کو مکمل اور صحیح راشن اور اچھی دردی ملنے لگی۔

عراق فرنٹ کی اُس وقت کیفیت یہ تھی کہ ترکوں نے انور پاشا کی کمان میں انگریزوں کے جنرل ٹاؤنسنڈ کو سلیمان پاک میں شکست دے کر پسایا اور اب اُسے کوۃ العمارہ میں محصور کر رکھا تھا۔ ناصریہ میں بہارسی فورس کا کمانڈر جنرل گورینج تھا۔ اُسے حکم ملا کہ کوۃ العمارہ میں ترکوں پر حملہ کر کے جنرل ٹاؤنسنڈ اور اُس کی فورس کو محاصرے سے نکالا جائے۔ میرے رسالے کو حکم دیا گیا کہ ناصریہ کے گرد پچیس میل کے دائرے میں دیکھ بھال (ریکی) کی جائے اور دشمن کی پوزیشن، عزائم اور تیاریوں کی معلومات فراہم کی جائیں۔ انگریزوں کے پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے ہمیں یہ اطلاع دی کہ شطرہ کے شیخ کا کوۃ العمارہ اور ناصریہ کے درمیانی علاقے میں پورا پورا اثر ہے اور وہ انگریزوں کا حامی اور خیر خواہ ہے، اس کی مدد سے رسالہ شطرہ کے قلعے کے تین میل قریب تک جا سکتا ہے لیکن اس سے آگے نہیں۔

ایک میڈیم توپ خانہ اور ایک ہیوی میٹری پہنچ چکی تھیں۔ ہمارے رسالے کو چند میل دور تک کے علاقے کی دیکھ بھال کا حکم ملا۔ پیادہ پلٹیں بھی اسی کام میں مصروف تھیں۔ یہ دیکھ بھال چند دن جاری رہی۔ عربوں نے کئی بار دُور سے ہم پر فائرنگ کی لیکن وہ قریب نہ آئے۔ ہمارے کچھ سوار اور گھوڑے زخمی ہو گئے۔ پھر برطانوی فوج کی مزید پلٹیں آگئیں جنہیں دریا کے دوسرے کنارے خیمہ زن کیا گیا اور فوجوں کی آمد و رفت کے لیے دریا پر کشتیوں کا پل بنا دیا گیا۔ ترکوں نے انگریزوں کی گن بوٹوں (جنگی کشتیوں) کو دُور پیچھے رکھنے کے لیے ہلہ کے قریب دریا کے کنارے کاٹ دیتے جس سے پانی دُور دُور تک پھیل گیا اور دریا کی گہرائی کم ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری فورس گن بوٹوں کی مدد سے محروم ہو گئی۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم تک راشن اور گولہ بارود پہنچا بند ہو گیا۔ دریا ہی سے سپلائی آتی تھی۔ اس کا پانی ترکوں نے پھیلا دیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں بہت ہی ناقص آٹا ملنے لگا۔ چینی کی جگہ سیاہ کا لاگوڑ آنے لگا۔ گوشت بالکل ہی بند ہو گیا۔ اچھا راشن صرف انگریزوں کو ملتا تھا۔ ہندوستانی فوج میں پیش کی دبا پھوٹ پڑی۔ وہاں کھجوروں کے باغ تھے۔ ہم وہاں سے کچی کھجوریں توڑ کر کھاتے تھے۔ پکٹی ہوئی کھجوریں گوروں کو ملتی تھیں۔ دراصل لارڈ کچر کی سکیم کے تحت ہندوستانی فوج کو دوسرے درجے کی فوج کی حیثیت دی گئی تھی جس کا کام ملک کے اندر امن کا تحفظ تھا، اس لیے ہندوستانی فوج کو میدان جنگ میں فوج والی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ لہذا میدان جنگ میں اسے راشن پانی پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ البتہ انگریزی فوج کے لیے تمام تر انتظامات کیے گئے تھے۔

اس علاقے میں کئی کنوئیں بھی تھیں مگر وہ ترکوں نے بھر دیئے تھے تاکہ انگریزوں کے کام نہ آسکیں۔ ہندوستانی سپاہی نیم فاقہ کشی، پیاس اور بیماریاں سے تنگ آ گئے۔ انہوں نے آخر انگریزی فوج کا راشن چوری کرنا شروع کر دیا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ انگریزوں کا راشن بڑی کشتیوں میں آتا تھا جس کے

وہاں سات میل قطر کی ایک جھیل بھی تھی جو مرغابیوں سے اُٹی رہتی تھی۔ دوسرے دن جنرل گورینج، پولیٹیکل آفیسر کے ساتھ شطرہ کے شیخ سے ملنے گیا۔ اُس کی حفاظت کے لیے کچھ پیادہ کپنیاں ساتھ گئیں۔ میراٹوپ (بتیس گھوڑے) بھی ساتھ تھا۔ شیخ چند اور شیخوں کے ساتھ ہمارے جنرل کے استقبال کے لیے قلعے کے دروازے میں آیا۔ پیادہ کپنیاں باہر کھڑی رہیں۔ البتہ میرے رسالے کو اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ یہ درمیانہ سائز کا قلعہ تھا۔ اس کے گرد وگد وجود دیوار تھی وہ بارہ فٹ اونچی تھی۔ ان دیواروں کے اوپر چھوٹے چھوٹے مینار اور دیوار میں فائر کرنے کے لیے سوراخ تھے۔ اندر شیخ کا مضبوط قلعہ تھا۔ جنرل گورینج کی خاطر و مدارات کی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُسے شیخ نے دروازے تک ساتھ جاکر الوداع کیا۔ جتنی دیر ہمارا جنرل اندر رہا، میں قلعے اور اس کی ساخت اور دیگر کوائف کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے بالکل علم نہ تھا کہ یہ جائزہ مجھے چند دنوں بعد ہی کتنا اہم فائدہ دے گا اور یہ قلعہ میری سپاہیانہ زندگی کا سنگِ میل بن جائے گا۔

شیخ شطرہ نے بڑے تپاک سے جنرل گورینج کو رخصت کیا۔ پیادہ اور سوار حفاظتی دستے چل پڑے۔ شیخ قلعے کے اندر چلا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ قلعے کے میناروں پر جو عربی سنتری کھڑے تھے وہ سر سے عبائے کر سر کے اوپر گول دارے میں لہرا رہے تھے۔ اندرونی قلعے کی چھت پر بھی مجھے کچھ آدمی اسی طرح عبائیں لہراتے نظر آئے۔ میں سمجھا کہ یہ ہمیں الوداع کہنے کا ایک انداز ہو گا مگر اچانک ہم پر ہر طرف سے فائر ہونے لگا۔ دھماکوں کی آوازیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ گولیاں دُور سے فائر ہو رہی ہیں۔ جنرل گورینج نے ہمیں تیز چلنے کا حکم دیا۔ ہم نے گھوڑوں کو ایڑیوں لگائیں اور قلعے سے دُور آگئے مگر ہمیں بہت جلد ہی احساس ہو گیا کہ ہم گھیرے میں آگئے ہیں اور اس سے زندہ نکلنا شاید ممکن نہ ہو۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ یہ شیخ شطرہ کی چال تھی بلکہ اُس نے انگریز جنرل کے لیے دوستی کا جال بچھایا تھا اور قلعے سے جو عبائیں ہل رہی تھیں وہ اُن ترکوں اور عربوں کے لیے اشارہ تھا جنہیں جنرل گورینج اور اس کی مختصر سی حفاظتی فورس کو محاصرے میں لینے کے لیے

میں اپنے رسالے کے ساتھ دیکھ بھال کے مشن پر نکلا۔ تین دن اور دو راتیں میرا رسالہ شطرہ سے ناصریہ تک دیکھ آیا۔ اس دوران پولیٹیکل آفیسر ساتھ رہا۔ اس علاقے کے چھوٹے بڑے شیخوں (سرداروں) سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ایک شیخ نے پولیٹیکل آفیسر کے اعزاز میں شہسوار کی کامظاہرہ دکھایا۔ میں نے عربوں کی شہسوار کی بہت قصے سُن رکھے تھے۔ اب اتفاق سے یہ مظاہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ چار نوجوان عربی لڑکیاں گھوڑوں پر سوار میدان میں آئیں۔ شیخ نے بتایا کہ آپ فرض کر لیں کہ تمام مرد باہر گئے ہوئے ہیں۔ گھروں میں صرف عورتیں ہیں یا اونٹ بکریاں اور گھوڑے۔ دشمن قبیلے نے حملہ کر دیا ہے۔ اب دیکھئے عورتیں کس طرح مقابلہ کرتی ہیں۔

میدان میں جگہ جگہ بھوسہ بھری بوریاں کھڑی کی گئی تھیں۔ چار نوجوان لڑکیوں نے سر پٹ گھوڑے دوڑائے۔ اُن کے ہاتھوں میں رافلیں تھیں۔ کسی نے تلوار منہ میں پکڑ رکھی تھی اور کسی نے کمر سے باندھ رکھی تھیں۔ لڑکیاں گھوڑوں کو پوری رفتار سے دوڑاتی دائیں بائیں گھاتی، بوریوں (ڈمبوں) پر فائر کرتی تھیں۔ ان کے نشانے بالکل صحیح تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ گھوڑوں پر زین نہیں تھی۔ لڑکیاں نگلی بیٹھ پر سوار تھیں اور وہ گھوڑے کی پیٹھ کو ٹانگوں میں دبا کر کنٹرول کرتی تھیں۔ شیخ کے سامنے آکر لڑکیاں بھاگتے گھوڑوں سے گود آئیں اور گھوڑے اپنے آپ رک گئے۔ میں اپنے آپ کو شہسوار کہلانے میں حتی بجانب ہوں۔ یہ تو میرا آبائی فن تھا۔ پھر عمر کا ایک بڑا حصہ جنگی شہسوار کی میں گذرا مگر میں عربی لڑکیوں کی شہسوار کی سے بہت متاثر ہوا۔

پولیٹیکل ایجنٹ نے ان عربوں کے دوستانہ سلوک سے متاثر ہو کر جنرل گورینج کو دو ٹوک سے کہہ دیا کہ پیشقدمی کے لیے حالات سازگار ہیں۔ چنانچہ میرے رسالے کو نمبر ۱۲ ریگیٹ کو، نمبر ۳ ٹوٹیس توپخانے کو پیشقدمی کا حکم ملا۔ ہم نے شیخ شطرہ کے قلعے سے چار میل کے فاصلے پر قیام کیا۔ یہ جگہ ناصریہ سے تیرہ میل دُور تھی، مگر یہ علاقہ سات سے نو فٹ گہرے برساتی ناووں اور تیس سے چالیس فٹ تک اونچے ٹیلوں اور خاردار جھاڑیوں کی وجہ سے دشوار گزار تھا اور



تیار رکھا گیا تھا۔

جنرل گورینج نے پیادہ دستوں کو حملے کی ترتیب میں کر کے حملے اور پیش قدمی کا حکم دیا مگر ترک اور عرب محاصرہ بہت تیزی سے تنگ کرتے آ رہے تھے۔ جنرل گورینج نے ہمیں حکم دیا کہ رسالہ چارج کرے یعنی ہلے بولے اور محاصرے کو چیر کر نکل جائے۔ میں نے اپنے ٹروپ کو تین حصوں میں تقسیم کر کے حکم دیا کہ تین مختلف جگہوں پر ہلے بولیں اور محاصرے سے نکل کر کسی ایک مقام پر اکٹھے ہو جائیں۔ محاصرے کی نوعیت اور شدت کو دیکھ کر میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ میرے کتنے سوار محاصرے سے نکل کر میرے اگلے حکم کے لیے اکٹھے ہو سکیں گے۔ سواروں نے تلواریں سونت لیں اور ہلے بول دیا۔ میرے ساتھ اب بمشکل دس گیارہ سوار رہ گئے تھے۔ میں نے کئی ایک سواروں کو گھوڑوں سے گرتے دیکھا۔ وہ گولیوں کی بوچھاڑوں میں جا رہے تھے۔ ہمیں اپنے توپ خانے کی بروقت مدد مل گئی تھی۔ گولہ باری انہی مقامات پر کی گئی جہاں سوار ہلے بولنے جا رہے تھے۔ اس سے بہت مدد ملی اور ہم گھیرے سے نکل آئے لیکن صورت حال بڑی ہی خطرناک تھی۔ یہ محاصرہ بڑے حملے کا پیش خیمہ تھا۔

جنرل گورینج نے ہمارے رسالے کی ایک فائننگ پٹرول ناصریہ بھی تاکہ ساری فورس کو حملے کی اطلاع مل جائے اور کمک تیار رہے۔ چند مزید پٹرولیں (گشتی پارٹیاں) مختلف سمتوں کو روانہ کی گئیں۔ میرا ٹروپ پولیٹیکل انفر کے ساتھ رہا۔ وہ چھوٹے چھوٹے شیخوں سے ملتا رہا۔ آخر ہم نے جمیل کے کنارے کیمپ لگایا۔ ہم گھوڑے اس طرح باندھا کرتے تھے کہ ایک لمبا اور مضبوط رستہ دونوں سروں سے زمین میں گاڑ دیتے تھے اور گھوڑوں کا ایک ایک پاؤں ایک ایک رستی سے اس رستے کے ساتھ باندھ دیتے تھے ہندوستان میں تو زمین مضبوط ہوتی تھی جس میں گاڑا ہوا رستہ باہر نہیں نکلتا تھا مگر عرب کی زمین ریتی تھی۔ ہم نے یہ نہ سوچا کہ رستہ ذرا سے زور سے نکل آئے گا۔ رات کے وقت عربوں نے ہمارے کیمپ پر فائر کیا۔ کچھ گولیاں پانی

میں لگیں اور کچھ گھوڑوں کے اوپر سے گذر گئیں۔ جمیل سے مرغابیاں گھبرا کر غول درغول پھڑپھڑا کر اڑیں۔ گھوڑے قریب ہی بندھے تھے وہ بدگ گئے اور سب گھوڑوں نے ایک ہی بار زور لگایا تو ریتلی زمین میں گڑا ہوا رستہ زمین سے نکل آیا۔ ایک ہی رستے سے بندھے ہوئے بتیس گھوڑے ہڑک کر دوڑے تو کیمپ کا سامان اور خیمے ساتھ ہی لیتے گئے۔ بعض نے رسیاں تڑالیں اور ان میں سے کچھ عربوں کی طرف چلے گئے اور انہی کے کام آئے۔ بعض کی رسیاں آپس میں الجھ گئیں اور وہ رگ گئے اور جو اکٹھے بندھے ہوئے بھاگتے دوڑتے رہے، انہوں نے کیمپ کی کوئی چیز سلامت نہ چھوڑی۔ صبح کے وقت ہم گھوڑوں کی خاصی تعداد سے محروم ہو چکے تھے۔ میرا گھوڑا خود ہی میرے پاس آ گیا۔ یہ گھوڑا میرے والد صاحب نے مجھے دیا تھا اور اسے میں نے خود ہی ٹریننگ دی تھی۔ مجھے اس گھوڑے سے اور گھوڑے کو مجھ سے بے حد پیار تھا۔

دوسرا دن کیمپ کو سنبھالتے اور نقصان پورا کرتے گذر گیا۔ گھوڑوں نے خوب تباہی مچائی تھی۔ جنرل گورینج نے رسالے کی فائننگ پٹرولیں مختلف اطراف کو بھیجیں تاکہ دشمن کے عوالم کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں۔ جب یہ پارٹیاں آگے بڑھتی رہیں ان پر ایک بھی گولی نہ چلی مگر واپسی کے وقت عرب سواران پر ٹوٹ پڑے۔ وہ کسی ایک جگہ رگ کر یا کہیں زمین پر پوزیشن لے کر فائر نہیں کرتے تھے بلکہ گھوڑے سرپٹ بھگاتے آتے تھے اور رائفل دونوں ہاتھوں میں تھام کر فائر کرتے تھے۔

جنرل گورینج نے آگے بڑھنے کی بجائے ناصریہ کی طرف پیچے ہٹنے کا حکم دیا۔ جوں ہی کیمپ اکھڑنا شروع ہوا، عربوں نے گولیوں کا مینہ برسا دیا۔ میں نے عربوں کی جنگی شہسواروں کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ گھوڑے پوری رفتار سے دوڑاتے اور فائر کرتے ہمارے کسی دستے کی طرف آتے اور قریب آکر لیکھت گھوڑوں کو موڑ لیتے۔ جوں ہی گھوڑے مڑتے، عرب سوار فوراً زمین پر گھوم کر گھوڑے کی دم کی طرف ہو جاتے اور فائر کرتے

ہوئے کسی کھڑنالے میں غائب ہو جاتے۔ میں ان کی دلیری اور شہسوارى پر حیران تھا۔ آج بھی میں انہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں — انہوں نے ہمارى پیادہ پلٹنوں کا بہت جانی نقصان کیا۔ میرا سالہ پیادہ پلٹنوں کے پہلوؤں پر تھا۔

جنرل گورینج نے حکم دیا کہ پیچھے جو ٹیلوں کا سلسلہ ہے اس پر فوراً قبضہ کیا جائے تاکہ عرب وہاں قابض ہو کر نمبر ۱۲ بریگیڈ کا راستہ نہ روک سکیں۔ میرا سالہ اس طرف گیا تو عرب سوار وہاں پہلے ہی موجود تھے۔ ہم نے گھوڑوں کو ایڑیں لگائیں اور چارج کیا۔ عرب گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم پر فائرنگ کرتے ہوئے غائب ہو گئے۔ ہمارے کئی ایک سپاہی شدید زخمی ہو گئے۔ ہمارى جو پلٹن آگے تھی اس پر عربوں نے حملے تیز کر دیے جن کی تاب نہ لاکر پلٹن ٹیلوں تک پیچھے ہٹ آئی۔ ہمارى مدد کے لیے ناصر یہ سے کمک روانہ ہو چکی تھی مگر عرب شہسوار اس کمک کی برى حالت کر رہے تھے۔ اس پر حملے کر کے اس کی رفتار بہت سست کر رکھی تھی۔ ہمیں بالکل امید نہیں تھی کہ عرب اس کمک کو ہم تک پہنچنے دیں گے۔ جنرل گورینج نے اسی خطرے کے پیش نظر ہمارے رسالے کو ٹیلوں پر مورچہ بند ہونے کا حکم دیا تاکہ پلٹن جو آگے عربوں کی زد میں آئی ہوئی ہے، کمک کا انتظار کرنے کی بجائے پیچھے ہٹے اور کمک سے جا ملے۔

ہمارے پاس ایونیشن کم رہ گیا تھا۔ ہمیں ہتھ بولنے کا حکم ملا۔ ایک پہاڑى برمنٹین توپ خانے کی چند ایک توپیں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے متعلق خطرہ پیدا ہوا تھا کہ عربوں کے قبضے میں چلی جائیں گی۔ ہم نے ہتھ بولا اور عربوں سے توپوں کو محفوظ تو کر دیا لیکن میرا سکواڈرن کمانڈر میجر ٹاورڈین سخت زخمی ہو کر گھوڑے سے گرا۔ عربوں نے قیامت پنا کر رکھی تھی۔ میں اپنے گھوڑے سے کودا۔ میجر ٹاورڈین کو اٹھا کر اپنے گھوڑے پر بٹولا اور گھوڑا دوڑا کر توپخانے کے مورچے میں لے گیا۔ وہاں پتہ چلا کہ کرنل وٹل اور میجر ولس بھی شدید زخمی ہو گئے ہیں اور جعدار ایجوٹنٹ اٹم سنگھ انہیں اٹھانے کے لیے گیا تو دو گولیوں سے

وہ مر گیا۔ میں دوڑنا گیا اور دونوں فوجی افسروں کو پیٹھ پر اٹھا کر لے آیا۔ وہاں سے میں اپنے رسالے سے جا ملا۔ معلوم ہوا کہ ہمارا رسالہ بہت جانی نقصان اٹھا چکا ہے اور کئی گھوڑوں سے محروم ہو چکا ہے۔

یہ معرکہ کا نازک اور خطرناک مرحلہ تھا۔ جنرل گورینج بار بار رسالے سے حملے کرتا تھا تاکہ پیادہ پلٹنوں کو پیچھے ہٹایا جاسکے۔ میرے رسالے کے تمام انگریز افسر اسے گئے یا شدید زخمی ہو گئے اور جعدار رسالدار بھی عربوں کی نذر ہو گئے تھے۔ میں اکیلا افسر رہ گیا تھا۔ توپ خانے کے کرنل راجد میں جنرل اگرین نے مجھے کہا کہ بائیں طرف اپنی دو توپیں سخت خطرے میں ہیں، ان پر ترکوں نے حملہ کر دیا ہے۔ اگر بروقت مدد نہ پہنچی تو توپیں ترک گھیبٹ کر لے جائیں گے۔

ہم نے برچیوں سے حملہ کیا۔ ترک پیچھے تو ہٹ گئے لیکن ہمارا بہت جانی نقصان کر گئے۔ ہمارے بہت سے جوان ہلاک یا زخمی ہو گئے۔ میں نے حملہ جاری رکھا تاکہ زخمیوں کو اٹھایا جاسکے۔ اس کوشش میں ایک گولی میرے گھوڑے کے سر میں لگی اور دوسری گولی اتنے قریب سے آئی کہ گھوڑے کے پیٹ میں سے گزر کر میرے گھٹنے سے بھی پار ہو گئی۔ گھوڑا اس طرح گر کر کہ میں اس کے نیچے آ گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ میرے سواروں نے مجھے گرتے اور گھوڑے کے نیچے دبتے دیکھا۔ وہ اس یقین کے ساتھ بھاگ گئے کہ میں مر گیا ہوں۔ میرے مرنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ گھوڑے کے بوجھ تلے مجھے مرنا ہی تھا۔

میں ہوش میں آیا تو شام ہو گئی تھی۔ میرے ارد گرد بہت سے آدمی کھڑے تھے۔ ذہن اچھی طرح بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ سب عرب تھے۔ میری وردی میرے اپنے اور گھوڑے کے خون سے لال سرخ ہو گئی تھی۔ ایک عرب نے مجھے وردی اتارنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرا رول اور میری تلوار چھین چکے تھے۔ انہوں نے میرے بوٹ بھی اُتروا دیئے اور مجھے گھوڑے پر لاد کر خطرہ قلعے میں لے گئے۔ چند ہی دن پہلے اسی قلعے میں ہمارا شاہی استقبال کیا گیا تھا۔ اب میں اسی قلعے

میں زخمی اور بے بس قیدی کی حیثیت سے داخل ہوا۔ مجھے شیخ شطرہ اور ایک ترکی افسر کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ یہ کیپٹن کا شقن تھا۔ شیخ شطرہ کے ہونٹوں پر طنز پر مسکراہٹ تھی۔ اُس کے ساتھ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ کیپٹن کا شقن کے حکم سے میرے گھٹے میں رستی ڈال دی گئی اور مجھے اُس کے خیمے کے سامنے کھجور کے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا جس طرح جانوروں کو باندھتے ہیں۔

میرے زخم کی کسی نے پروا نہ کی نہ مریم بیٹی کی۔ سب مجھے غصے سے گھومتے تھے میرے جسم پر واحد جو کچھ تھا وہ ایک اندر دیر تھا۔ رات کے وقت انہوں نے میرے اگے روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے پھینک دیئے اور مٹی کے گوزے میں پانی میرے قریب رکھ دیا۔ میں نے زروٹی کے ٹکڑوں کو ہاتھ لگایا نہ پانی پیامگرات کے وقت جھوک نے اتنا مجھ پر دیا کہ میں نے روٹی کے ٹکڑے کھا لیے اور پانی پیا۔ یہ جو کی روٹی تھی۔ مجھے زخم پریشان کر رہا تھا۔ خون بہت نکل گیا تھا جس سے جسم میں کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ مسلسل کئی روز لڑنے اور آرام نہ کرنے کے بد اثرات الگ تھے۔ پھر بھی میں فرار کی ترکیبیں اور راستے سوچ رہا تھا۔

ادھی رات کے وقت قلعے کے اندر سکوت طاری ہو گیا۔ جنگ کی وجہ سے کوئی بتی نہیں جل رہی تھی۔ ہر سو گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے رستی کی مضبوطی کو دیکھا۔ اللہ نے مجھے جسمانی قوت بھی عطا کی تھی اور قوتِ ارادی بھی۔ میں نے رستی توڑ لی اور میں قلعے کی بارہ فٹ اونچی دیوار پھلانگ کر قلعے سے نکل گیا میں جب یہاں جنرل گورینگ کے ساتھ اس قلعے میں آیا تھا تو قلعے کے محل وقوع اور دیگر کوائف کا جائزہ بغور لیا تھا۔ وہ جائزہ میرے کام آیا۔ اُس وقت مجھے اپنے بچپن کے زمانے کے ایک مشہور ڈاکو ستسی کی باتیں یاد آئیں اور یہ باتیں میرے کام بھی آئیں۔ میرے گھٹنے سے گولی پار ہو گئی تھی۔ درد کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ ٹانگ بیکار ہو گئی تھی لیکن میں نے درد اور معذوری کو قبول نہ کیا۔ انسان کچھ کرنے کا عزم رکھتا ہو تو جسمانی درد اور معذوریوں اُس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتیں۔

دریائے دجلہ قریب ہی تھا۔ میں دریا میں اتر گیا اور بہاؤ کے ساتھ تیرنے لگا۔ باقی رات تیرتے گزری۔ صبح طلوع ہونے لگی۔ میں دریا سے نکلا اور کھجوروں کے

ایک باغ میں جا چھپا۔ جنگ کی وجہ سے باغ کے اندر اور باہر کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ دُور سے عربوں کی آوازیں سنائی دیں اور گھوڑوں کی گرد بھی دکھائی دی۔ میں نے سارا دن وہیں چھپ کر گزار دیا۔ گھٹنے کے زخم پر کوئی مرہم پٹی نہیں ہوئی تھی۔ زخم ننگا تھا۔ میں خود بھی تنگ تھا۔ زخم پر کیا باندھتا! ایک اندر دیر پہن رکھا تھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہوا تو میں دریا کی طرف چل پڑا۔ ٹانگ اکڑتی جا رہی تھی۔ گھٹنے ہلتا تھا تو درد کی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ میں دریا میں اتر گیا اور بہاؤ کے ساتھ ترے لگا دریا غٹے دجلہ کے ساتھ ہماری کتنی ہی پیاری اور حید باقی یادیں وابستہ

ہیں۔ اسلام کی جنگی تاریخ میں دجلہ کو نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ اس دریائے کتبے ہی معرکے دیکھے ہیں۔ اس کے کنارے کتنی ہی بار خون میں ڈوبے ہیں۔ اس کی روانی تاریخ کی ولولہ انگیز کہانیاں سناتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں عربوں اور ترکوں کے خلاف لڑ رہا تھا لیکن میں دجلہ کا ہی سپوت تھا اور دجلہ مجھے اغوش میں لیے بڑے پیار سے خظروں سے دُور ہی دُور، دُور ہی دُور لے جا رہا تھا اور میرے درد کو سہلا رہا تھا۔

صبح طلوع ہونے سے ذرا پہلے میں دریا سے نکلا اور ایک گہرے نالے میں چھپ گیا۔ میرے قریب سے بہت سے عربی سوار گزرے۔ وہ غالباً ناصریہ میں ہمارے کیمپ پر رات کو فائرنگ کرتے رہے تھے اور صبح طلوع ہونے سے پہلے پہلے اپنے اپنے ٹھکانے پر جا رہے تھے۔ وہ میرے بہت ہی قریب سے گزرے۔ میرا دل ڈوبنے لگا مگر سحر کے دھندلے میں وہ مجھے دیکھ نہ سکے۔ میں اٹھا اور چل پڑا۔ اب تو گھٹنے چلنے بھی نہیں دے رہا تھا۔ زخم میں پانی چلا گیا تھا۔ درد ناقابل برداشت تھا۔ جھوک اور پیاس الگ پریشان کر رہی تھی مگر مجھے چلنا تھا اور کیمپ میں پہنچنا تھا۔ میں قوتِ ارادی کے زور پر چلنا لگا۔ صحرانے مجھے کڑے امتحان میں ڈال دیا۔ میں نے ہمت کا دامن نہ چھوڑا۔ سورج میرے ننگے جسم کو جھلساتا رہا اور میں دن بھر زخمی ٹانگ کو گھسیٹا رہا۔ رات کے وقت میں ناصریہ کیمپ کے قریب پہنچ گیا اور وہیں بیٹھ گیا۔

صبح طلوع ہوئی۔ میرے رسالے کے چند ایک سوار ادھر سے گزرے۔ وہ

اپنی گشتی ڈیوٹی پر جبار ہے تھے۔ یہ ڈوگر اسکیشن تھی۔ ایک سو اسی سو سال سے ساتھ ہو گیا۔ اُس نے اپنی پانی کی بوتل مجھے دے دی جو میں نے پی لی۔ اُس نے مجھے اپنے گھوڑے پر سوار کر لیا۔ جب میں اپنے کیمپ میں پہنچا تو رسالے کا نیا کمانڈنگ آفیسر آچکا تھا۔ اُس نے مجھے وردی پہننے کو بھیج دیا۔ میں اپنے خیمے کی طرف جبار ہاتھا تو میرا اردلی ملن بخش جو میرا پورا آزاد کشمیر کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا، راستے میں مل گیا۔ وہ تو مجھے مُردہ سمجھ چکا تھا۔ ہر کسی کو یقین تھا کہ میں مر گیا ہوں میں نے اُسے بکارا۔ ”میرا بخش میں آگیا ہوں“۔ میرا بخش نے جب مجھے ننگا دیکھا اور میرے جسم کو ریت سے لہوڑا ہوا دیکھا تو وہ سمجھا کہ میں مرے ہوئے اکبر خان کا بھوت ہوں۔ اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں، پھر اُس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ جینتا چلاتا، سخت خوف زدہ اُسے پاؤں بھاگا مگر زیادہ دوڑ نہ سکا۔ دہشت سے بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

میں وردی پہن کر کمانڈنگ آفیسر سے ملا۔ مجھے ہسپتال بھیج دیا گیا لیکن میرا بخش ہوش میں نہیں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو اُس نے کہا کہ اپنے مولوی سے کہو کہ اُسے اور اُس کے پاس بیٹھ کر قرآن پڑھے یا دم کرے۔ مولوی کو بلایا گیا جس نے دم دُرو کیا مگر میرا بخش نے بیدار ہوتے کئی دن لگا دیئے۔

تو یہ ہیں میری وہ یادیں جو ترکی کے کمانڈر انچیف جنرل کاشقن کو دیکھ کر تازہ ہو گئی تھیں۔ میں نے چمک لالہ دراول پینڈی کے میس میں اُسے اپنے فرار کی روئیداد سنائی تو اُس نے بہت لطف اُٹھایا۔ اُس نے تو مجھے اپنے خیمے کے سامنے کھجور کے درخت کے ساتھ جانوروں کی طرح باندھ دیا تھا۔ جنرل کاشقن میرے گھر سے دوست بن گئے۔ اُس وقت جنرل گروسل اُن کے چیف آف سٹاف تھے جو بعد میں ترکی کے کمانڈر انچیف بنے اور پھر ترکی کے صدر بن گئے تھے جنرل کاشقن نے جب دیکھا کہ میرے دل میں ترکوں کی کتنی محبت ہے اور میں ان کی جنگی اہلیت اور شجاعت کا کتنا شیدائی ہوں تو انہوں نے ترکی جاکر مصطفیٰ کمال پاشا کے میرے لیے جنگی نقشے اور حالات بھیجے۔ ان کی مدد سے میں نے تین کتابیں لکھیں

”مصطفیٰ کمال پاشا“ ”اتاترک“ اور ”ترکوں کا جہاد“

تمھوڑا عرصہ گزرا جنرل کاشقن کا بھتیجا کراچی میں بلا تھا۔ وہ اُس وقت استنبول کا میئر تھا۔ میں ترکوں، عربوں اور دھیلہ کے مقدس پانی کو عقیدت کا سلام پیش کرتا ہوں۔



www.urduinovels.com

www.facebook.com/urduinovels



## جب ہم نے دہشت پسندوں کو پکڑا

۱۹۱۴ء میں میرا رسالہ میرٹھ چھاؤنی میں گیا۔ میں لانس نامک بن چکا تھا اور مزید ترقی کے لئے فرنٹ کلاس روسن اردو کا امتحان دینے والا تھا۔ میں ہاکی کا نامی گرامی کھلاڑی تھا۔ ایک شام میں ہاکی گراؤنڈ سے واپس آ رہا تھا۔ راستے میں رسالے کے ایجوٹنٹ کیپٹن واٹسن نے روک لیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ یہ حیرت کی بات تھی کہ ایک انگریز افسر ایک ہندوستانی لانس نامک کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ چند ایک ادھر ادھر کی باتیں کر کے اُس نے مجھ سے پوچھا۔ ”تم میرے کالج کے ہاکی کے مشہور کھلاڑی حیدر کو جانتے ہو؟“

”بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”آخری بار اُسے کب ملے تھے؟“

”ٹورنامنٹ کے دوران۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کالج کی ٹیم ہم

سے ہار گئی تھی۔“

”وہ رسالے کی گراؤنڈ میں کھیلنے نہیں آتا؟“

”ہیچ کے بغیر تو کبھی نہیں آیا۔“

”اگر حیدر یہاں آتے یا تمہارے پاس سے گزرتے تو تم اسے پہچان

لو گے؟“

”ضرور پہچان لوں گا۔“

”دیکھو۔“ کیپٹن واٹسن نے راز داری سے کہا۔ ”اس گفتگو کا کسی

سے ذکر نہ کرنا۔ کوئی پوچھے کہ صاحب کے ساتھ کیا باتیں ہو رہی تھیں تو کہنا کہ صاحب ہاکی ٹیم کے متعلق پوچھ رہا تھا۔“

دوسرے دن کیپٹن واٹسن نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور کہا —  
”تم کو آج سے ملٹری پولیس کی ڈیوٹی دی جا رہی ہے۔ اب اپنے آپ کو ملٹری پولیس میں سمجھو۔ ہمارا ڈیوٹی یہ ہوگی کہ میرے شہر اور چھاؤنی کے ریلوے سٹیشنوں پر ریل گاڑیوں سے رسالے کے جو جوان اور رنگروٹ آتے ہیں انہیں لاتنر (رسالے کی بارکوں) میں لاؤ۔ ہر رات ٹو بجے مجھے آفیسر میں میں رپورٹ دو کہ رات آٹھ بجے دہلی سے جو بمبئی میل آتی ہے اس میں ہاکی کا کھلاڑی آیا ہے یا نہیں، لیکن یاد رکھو یہ ایک راز ہے۔ کسی کو بتانا نہیں کہ تیسری ڈیوٹی میں حیدر کی سرانجامی بھی شامل ہے۔“  
ڈیوٹی بڑی سخت تھی۔ صبح چار بجے آٹھ کر پیدل میرے چھاؤنی کے سٹیشن پر جانا پڑتا تھا۔ پنجاب کی طرف سے آنے والی تمام ریل گاڑیوں کو دیکھنا پڑتا تھا۔ یہ سلسلہ ایک بجے تک لگا رہتا۔ شام کو میرے شہر کے جکشن سٹیشن پر تین بجے سے رات ساڑھے آٹھ بجے تک وہ تمام گاڑیاں دیکھنی پڑتیں جو غازی آباد، ہاترس اور براہنچ لاتنر سے آتی تھیں۔ دو ماہ تک میں ہر رات ٹو بجے کیپٹن واٹسن کو رنگروٹوں اور جوانوں کی آمد کی رپورٹ دیتا رہا مگر حیدر نظر نہیں آیا۔

کیپٹن واٹسن نے ایک رات کہا — ”حیدر چارپانچ بار یہاں آچکا ہے۔ رات شہر یا چھاؤنی میں گزرا کر چلا جاتا رہا ہے، لیکن پولیس کو اس وقت پتہ چلا جب وہ جا چکا ہوتا تھا۔“

میں بہت ہی حیران تھا کہ حیدر کون ہے اور پولیس اسے کیوں ڈھونڈ رہی ہے۔ میں کیپٹن واٹسن سے پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے رسالے کی نفری کتنی گنا بڑھ گئی تھی۔ رنگروٹ اور سنے گھوڑے دھڑا دھڑا آ رہے تھے۔ ہمارے رہنے کا انتظام بہت ناقص تھا جن کمروں میں ہم رہتے تھے ان کی چھتیں بچہ نہیں بلکہ کچرے میں تھیں۔ برسات میں ان پر کد آجی بیٹھ جاتے تو کھیر بل جھک جاتی اور بانی کمرے میں گر جاتا۔ میں نے

ایک لمبا بانس رکھا ہوا تھا۔ رات بارش میں چھت سے پانی مجھ پر گرنے لگتا تو میں بانس نیچے رکھ کر چھت کو اٹھا دیتا تھا جس سے پانی کسی دوسرے جہان کی چارپائی پر گرنے لگتا تھا۔ اس طرح میں ”جس کی لائٹھی اس کی بھیجس“ والا قانون چلاتا تھا۔ میں ہاکی کا کھلاڑی بھی تھا، ایٹھلیٹ بھی اور پہلوان بھی تھا۔ اس کے علاوہ میں ایجوٹنٹ کا مینہ چڑھا ملٹری پولیس کا لائسنس نامک تھا، اس لئے کسی کو میرے منہ آنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

ایک رات میں اپنے کو ارد گرد سے باہر میدان میں سویا ہوا تھا۔ نصف شب کے وقت مجھے کیپٹن واٹسن نے جگایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تو اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور میرے کان میں کہا کہ ننگے پاؤں میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تین آدمی اندھیرے میں کھڑے نظر آتے۔ ذرا قریب گیا تو دیکھا کہ ان کے کپڑے کالے تھے اور ان کے آدھے آدھے چہرے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔

کیپٹن واٹسن نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ ان کے پیچھے پیچھے جاؤ۔ یہ لوگ رسالے کے سکھ سکھ اڈرن کے ایک بند کمرے کے دروازے پر دستک دیں گے۔ دروازہ کھلے گا۔ اندر روشنی ہوگی۔ اندر تمہیں دو سکھ نظر آئیں گے اور ایک بنگالی۔ تم بجلی کی تیزی سے بنگالی کو دلوچ لینا۔

”یاد رکھو“ کیپٹن واٹسن نے کہا — ”اگر تم نے اس بنگالی کو چلنے بچنے کی مہلت دی تو خود بھی مرنے والے اور ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہ سکے گا۔“ پھر کیپٹن واٹسن نے یہ انکشاف کر کے مجھے چور کا دیا — ”یہ بنگالی ہاکی کا مشہور کھلاڑی حیدر ہو گا جسے تم اچھی طرح جانتے پہچانتے ہو۔“

یہ تین آدمی جن کے پیچھے مجھے کمرے میں داخل ہونا تھا، ان کے نام یہ بتاتے گئے — نادر خان، نادر شاہ اور زریں گل۔ بعد میں پتہ چلا کہ نادر خان ضلع راولپنڈی کے ایک مشہور قبیلے گوجر خان کا رہنے والا ہے اور باقی دو سچان ہیں۔

ہم دہلی پاؤں اس بند کمرے تک گئے۔ نادر خان نے ایک خاص انداز سے

دستک دی۔ اندر سے بھی ایسی ہی دستک سُناؤتی دی۔ یہ باہر کی دستک کا جواب تھا بلکہ یہ کوئی پُر اسرار اشارہ تھا جو نہی دروازہ کھلا، نادر خان اور زریں گل دونوں کھول پر جھپٹے۔ مجھے مدھم سی روشنی میں حیدر نظر آیا۔ میں نے ہدایت کے مطابق چیتے کی طرح جھپٹ کر اُسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اُس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لاتیں ماریں مگر مجھ جیسے چھ فٹ لمبے پہلوان کے ٹبکنے سے اُس کا ٹکنا ناممکن تھا۔ کیپٹن واٹسن اور نادر شاہ پستول تانے کھڑے تھے۔ رستیاں ساتھ تھیں۔ حیدر اور دونوں کھول کے ہاتھ باندھ دیتے گئے۔ میں نے حیدر کو کندھے پر اٹھا لیا۔ باہر گئے تو کچھ اور لوگ کھڑے تھے۔ موٹر گاڑی تیار کھڑی تھی۔ قیدیوں کو اس میں ڈال دیا گیا۔

”جا کر سو جاؤ“۔ کیپٹن واٹسن نے مجھے کہا۔ ”اس سلسلے میں مُنہ بند رکھنا۔ کوئی پوچھے تو لاعلمی ظاہر کرنا۔ صبح سویرے روزمرہ کی طرح ریلوے سٹیشن پر چلے جانا اور رات نو بجے مجھے میس میں رپورٹ دینا“ عجیب ڈرامہ تھا۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ چونکہ یہ ایک راز تھا اس لئے کسی سے ذکر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی اور سوچ سوچ کر میرا سر دُکھنے لگا کہ یہ حیدر کون ہے؟ کیا ہے؟ جو کچھ بھی ہے وہ بنگالی نہیں۔ اپنے آپ کو لکھتو کار بننے والا مسلمان بتایا کرتا تھا۔ صاف سُٹھری اُردو بولتا تھا۔ میرے کالج میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ بڑی ٹھاٹھ سے رہتا تھا اور کالج میں احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس سے زیادہ میں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

اُن دنوں ”لاہور سازش“ کا بہت چرچا تھا۔ دہشت پسند تحریک زوروں پر تھی۔ کئی جگہوں پر بم پھٹنے کے واقعات ہو چکے تھے۔ ”لاہور سازش“ کے متعلق اخباروں میں کم ہی کچھ چھپتا تھا۔ افواہیں سُنی اور سُناؤتی جاتی تھیں۔ ہمارے کونوں میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ کالوں کاں پتہ چلتا تھا کہ فلاں پلٹن کے اتنے سردار اور جوان پکڑے گئے ہیں یا یہ کہ انہیں لڑائی میں بھیج دیا گیا ہے۔ جنگ عظیم اول شروع ہو چکی تھی۔ بعد میں

پتہ چلتا کہ انہیں لڑائی میں نہیں بھیجا گیا بلکہ کورٹ مارشل کر کے انہیں یا تو عمر قید کی سزا دی گئی ہے یا پھانسی چڑھا دیا گیا ہے۔ اس طرح بے شمار فوجیوں کو عمر قید یا سزائے موت دی گئی۔ ہمارے رسالے کے ”یونٹ آرڈر“ میں اس قسم کی اطلاعات شائع ہوا کرتی تھیں کہ فلاں سردار (جمعہ دار، رسالدار، رسالدار میجر، عہدیدار یا جوان کو لڑائی میں بھیجا گیا تھا مگر وہ جھگڑا ہو گیا ہے۔ لہذا اُس کی تنخواہ اور فیملی الاٹمنٹ بند کر دی گئی ہے۔ ہم سمجھ جاتے تھے کہ اُسے درپردہ پھانسی دے دی گئی ہے یا عمر بھر کے لئے کالے پانی (جزائر انڈیاں) بھیج دیا گیا ہے۔

نادر خان، نادر شاہ اور زریں گل غائب ہو گئے۔ میں نے انہیں پھر کبھی نہیں دیکھا۔ انہیں رسالے کے عہدیدار ظاہر کیا گیا تھا۔ یونٹ آرڈر میں تینوں کے متعلق یہ اطلاع چھاپی گئی کہ انہیں لڑائی میں بھیج دیا گیا ہے۔ ”لاہور سازش“ کے متعلق بعض اخباروں میں مختصر سی یہ خبر شائع ہوتی کہ ”کاگا کا نامارو“ نام کی ایک دہشت پسند تحریک کے افراد بنگال سے پنجاب آگئے ہیں جن میں سے کئی ایک کو گرفتار کر کے لاہور کے شاہی قلعے میں بند کر دیا گیا ہے۔ ان کے خلاف مقدمات کی خفیہ سماعت ہو رہی ہے۔ ان مقدمات کے دوران جو انکشافات ہو رہے ہیں وہ بھی مصلحتاً عوام کو نہیں بتاتے جاتے گے۔

چند ماہ بعد مجھے ترقی دے کر جمعہ دار بنا دیا گیا۔ (آج کل یہ عہدہ نائب رسالدار کہلاتا ہے)۔ اور اس کے ساتھ ہی رسالے کو سمندر پار جنگ میں جانے کا حکم مل گیا۔ رسالہ بصرہ پہنچ گیا۔ اس محاذ پر ہمارا سامنا عربوں اور ترکوں سے تھا۔ بعد میں، میں ترکوں کے ہاتھوں قید ہو گیا اور زخمی حالت میں قید سے بھاگ بھی آیا۔

ہندوستان کی متعدد دیادہ اور رسالہ نویس محاذ پر لڑ رہے تھے۔ کچھ فرانس میں اور کچھ میسوپوٹیمیا (عراق) میں۔ ہم بصرہ پہنچے تو پہلی خبر یہ سُنی کہ ایک رسالے، ۱۵ ملتان لائبریرز اور پچھانوں کی ایک پیادہ پلٹن فرنیٹز

فوری نے ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ یونٹیں فرانس سے آتی تھیں۔ ان سے ہتھیار لے کر منہ کر دیا گیا تھا اور وہ گورا پلٹنوں کی زیرِ حراست تھیں۔

ایک انگریز جرنیل، جنرل نکسن نے فرنیٹر فورس بٹالین کے صوبیدار میجر اکبر خان سے کہا — ”دیکھو صوبیدار میجر صاحب! اپنے جوانوں کو سمجھاؤ اور ان کو ڈراؤ کہ ہم ان سب کو بغاوت کے جرم میں گولی مار دیں گے“ مجھے آج تک اس پٹھان صوبیدار میجر کا جواب یاد ہے۔ اُس نے اس انگریز جرنیل کو جواب دیا — ”صاحب بہادر! میرے سینے پر منظر ڈالو۔ یہ تمہیں دیکھو۔ ہم نے جرنیلوں کے خلاف لڑ کر، آتی۔ ڈی۔ ایس۔ ایم، آتی۔ او۔ ایم، اور، ملٹری کراس، حاصل کیا ہے۔ یہ تمہیں ہم نے بہادری کے صلے میں حاصل کیا ہے۔ میں ہنگو صاحب بہادر بہت افسوس ہے کہ تم ہم کو گولی سے ڈراتے ہو تم کو کیا ہو گیا ہے صاحب بہادر؟... جاؤ، جو مرضی ہے کرو۔ ہم کافر ہو کر نہیں مریں گے“

یہ پہلا واقعہ ہے جس نے میری بصیرت کو روشنی دی۔ دوسرا واقعہ نمبر ۱۵ لائسنز کا ہے۔ اس رسالے کا رسالدار میجر فرانس میں بیمار ہو کر ہسپتال چلا گیا تھا۔ اس کی جگہ رسالدار یعقوب خان عارضی طور پر رسالدار میجر کی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ اسے بھی جنرل نکسن نے وہی الفاظ کہے جو صوبیدار میجر اکبر خان کو کہے تھے۔ یعقوب خان کا جواب بہت ہی سخت، باغیانہ اور دشمنانہ تھا جسے انگریز جرنیل برداشت نہ کر سکا۔ رسالدار یعقوب خان کو عمر قید کی سزا دے کر جزائر انڈیمان بھیج دیا گیا۔

ایک رجمنٹ بنگال کی بھی تھی۔ یہ بنگال کی پہلی اور واحد رجمنٹ تھی۔ اس پوری کی پوری رجمنٹ نے بھی ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا تھا اور اس پوری کی پوری رجمنٹ کا اجتماعی کورٹ مارشل کر کے اسے عمر قید کی سزا دے کر جزائر انڈیمان بھیج دیا گیا تھا۔ ۱۵ ملتان لائسنز اور فرنیٹر فورس کو برما میں کہیں بھیج کر نظر بند کر دیا گیا تھا۔

پاکستان میں پیدا ہونے والے بچوں کو شاید معلوم نہ ہو کہ کالا پانی کیا ہے۔ جزائر انڈیمان خلیج بنگال کے دورِ نیچے ایک بڑا جزیرہ اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ ہندوستان میں قاتلوں، پیشورنامی گروئی ڈاکوؤں اور باغیوں کو عمر قید کی سزا دے کر انڈیمان بھیج دیا جاتا تھا جہاں سے قیدی کے لئے قرار نامہ ممکن ہوتا تھا — ”فلاں کو کالا پانی بھیج دیا گیا ہے“ — اسے کالا پانی اس لئے کہا جاتا تھا کہ ان جزائر کے ارد گرد سمندر بہت گہرا ہے۔ اتنی زیادہ گہرائی کی وجہ سے سمندر کا پانی نیلا نہیں بلکہ سیاہ نظر آتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں جاپانیوں نے یلغار کر کے جزائر انڈیمان پر قبضہ کر لیا تھا جو زیادہ دیر نہ رہ سکا لیکن کوئی ایک بھی قیدی واپس نہیں آ سکا تھا۔ اس کے بعد یہ قید خانہ بند کر دیا گیا تھا اور پھر برصغیر تقسیم ہو گیا۔

پہلی جنگِ عظیم میں جب مسلمان رسالے اور پلٹنیں ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر چکے تھے، عراق کے محاذ پر انگریزوں کی حالت بہت بُری تھی۔ ترکوں نے ان کے چھلکے چھڑا دیتے تھے۔ انگریزوں کا مسلمانوں پر اعتماد اُٹھ گیا، اور یہ بھی ایک سیاسی چال تھی کہ انگریزوں نے مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑانے کی کوشش کی۔ ہر لیونٹ میں ایک مولوی (پیش امام) بھی ہوتا تھا جسے سرکاری خزانے سے تنخواہ ملتی تھی۔ ہر ایک انسر اور جو ان ٹریننگ ختم کر کے حلف اُٹھاتا تھا کہ میں ہر حکم مانوں گا اور مجھے دُنیا کے کسی بھی حصے میں جس کسی کے خلاف لڑا جاتا ہے گا، لڑوں گا وغیرہ.... ہمارے مولوی صاحبان نے ہمیں یہ حلف وفاداری یاد دلایا اور وعظ کئے کہ ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کرنا جرم اور گناہ ہے

افسوسناک امر یہ ہے کہ ان مولویوں نے اپنے مسلمان سپاہیوں کو درپردہ بھی کبھی یہ نہ بتایا کہ ترک جو جنگ لڑ رہے ہیں وہ جہاد ہے اور ہم جہاد کے خلاف لڑ کر کفر کا ارتکاب کر رہے ہیں مگر مولویوں کو انگریز کی خوشنودی زیادہ عزیز رہتی۔



نادر خان اور اُس کے دو ساتھی، نادر شاہ اور زریں گل رسالے یا فوج کے ملازم نہیں بلکہ وہ بنگال پبشیل پولیس کے سرانفرسانی کے شعبے کے بڑے ہی ہوشیار اور ذہین افراد ہیں۔ انہیں حیدر کی گرفتاری کے لئے سیر پٹ لایا گیا تھا اور ان کی اصلی حیثیت کو بھپانے کے لئے انہیں اس رسالے میں بھرتی کیا گیا تھا۔ زریں گل کو دفعتدار، نادر کو لانس دفعتدار اور نادر شاہ کو بے اسپر (بغیر گھوڑے کے) سپاہی بنایا گیا تھا۔ باغ علی نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ کلکتہ میں رہتا تھا۔ وہاں اُس نے آٹھ جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے لیکن وہ انگریزی اور بنگالی زبانیں روانی سے بولتا اور لکھتا تھا۔

مزید انکشافات کے مطابق نادر خان انگریزوں کا بڑا ہی ہوشیار سرانفرسٹ اور جاسوس تھا۔ اُس نے بنگالی دہشت پسندوں کو گرفتار کرانے میں حیران کن رول ادا کیا تھا۔ اُس کا کھال یہ تھا کہ ایک بار دہشت پسندین کر ایک گروہ کے ساتھ جا ملا۔ اُن کے ساتھ اُس نے دستی بم بھی بناتے اور پورے گروہ کو جال میں الجھا کر ایسے موقع پر گرفتار کر لیا جہاں سے وہ نکل نہیں سکتے تھے۔

بمبئی میں کوئی زمین دوز گروہ کرنسی نوٹ بناتا تھا اور یہ جعلی کرنسی اصلی کے روپ میں منڈی میں چل رہی تھی۔ ہزار کوشش کے باوجود اس گروہ کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ آخر نادر خان نے اس گروہ کو اس طرح گرفتار کر لیا کہ اُس نے کہیں سے نوٹ بنانے کا فن سیکھا پھر اس گروہ کا سراغ لگایا۔ ان کے خفیہ اڈے تک پہنچا۔ کچھ عرصہ وہاں نوٹ تیار کتے اور ایک روز پورے کا پورا گروہ اس حالت میں پولیس کے چھاپے میں پڑا گیا کہ نوٹ تیار ہو رہے تھے اور گروہ کے تمام افراد موجود تھے۔ تب انہیں پتہ چلا کہ نادر خان ان کا ساتھی نہیں بلکہ جاسوس ہے۔

نادر خان دراصل دہشت پسندوں کے لئے دہشت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسے بہروپ میں کوئی پہچان نہیں ملتا تھا۔ اس کی زندگی ہر لمحہ خطرے میں رہتی تھی۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ نادر شاہ اور زریں گل کا بنگالی دہشت پسندین

میں حیدر کو میر پٹھ کالج کی ہائی ٹیم کے کھلاڑی کی حیثیت سے جانتا تھا مگر اُس کی یہ ڈرامائی اور پراسرار گرفتاری میرے لئے معجزہ بن گئی اور اس کے ساتھ نادر خان، نادر شاہ اور زریں گل بھی میرے لئے معجزہ بن گئے تھے۔ یہ لوگ کون تھے؟ اچانک سامنے آئے اور غائب ہو گئے۔ مجھے اس ڈرامے میں صرف اس لئے شامل کیا گیا تھا کہ میں حیدر کو پہچانتا تھا اور میرے جسم جُتے میں اتنی طاقت تھی کہ ایسے تین چار حیدر شکنے میں جکڑ سکتا تھا۔

کیسے، میں آپ کو پھر میر پٹھ چھاؤنی لے چلوں۔ نادر خان، نادر شاہ اور زریں گل غائب ہو گئے تو چند دن بعد باغ علی نام کے ایک نوجوان کو ہمارے رسالے میں بھرتی کیا گیا۔ اس کے متعلق مجھے یہ پتہ چل گیا کہ وہ اُس نادر خان کا بیٹا ہے جس نے وردازے پر دستک دے کر وردازہ کھلویا اور میرے ہاتھوں حیدر کو پکڑ دیا تھا۔ باغ علی جُست و چالاک، سوچہ بوجھ والا اور تیز نظر نوجوان تھا۔ ہائی کھیلتا تھا۔ محنت کر کے وہ رسالے کی ٹیم کا گول کیپر بن گیا اور بہت اچھا گول کیپر ثابت ہوا اور سوار بھی اچھا نکلا، مگر رسالے کے جوان اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ اس کے باپ نادر خان کو ہتھکڑی لگا کر لے جایا گیا تھا پھر اس کے بیٹے کو دوسرے رنگ و ٹول کے مقابلے میں غیر ضروری مراعات کیوں دی جا رہی ہیں مثلاً باغ علی کو آفیسر زریں کا کوک بنا دیا گیا اور اسے وہاں رہنے کے لئے الگ کمرہ دے دیا گیا۔ حالانکہ میں بھی میس کی کلر کی کرچکا تھا لیکن مجھے الگ کمرہ نہیں دیا گیا تھا۔ کمرے کے علاوہ باغ علی کو میس سے مفت اور نہایت اچھا کھانا ملتا تھا۔

ہمارا سالہ عراق کے محاذ پر گیا تو باغ علی بھی ساتھ تھا۔ اب تو اُس کے خلاف جوائنوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ کوئی بھی اُس سے مُنہ نہیں لگاتا تھا۔ میرا رویہ مختلف تھا اس لئے باغ علی اکثر میرے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ میں نے اُس سے اُس کے متعلق پوچھا تو اُس نے بتایا کہ وہ واقعی نادر خان کا بیٹا ہے اور گوجر خان کا رہنے والا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس کا باپ



رہ گئے۔ نظام حیدر آباد دکن نے اپنی فوج کے اخراجات پورے کرنے کے لئے براہ کراہت سا وسیع و عریض زر خیز علاقہ انگریزوں کو دے دیا۔ مدراس اور بنگال انگریزوں کی طاقت کے مرکزی علاقے تھے۔ کلکتہ ہندوستان کا دار الحکومت تھا۔ ان علاقوں میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ وقف کی جائدادیں جن سے مسلمانوں کے مدرسے چلتے تھے، ضبط کر لی گئیں۔ بنگال میں اس جبر و تشدد کے خلاف تینتویر اور دھوڑو میاں کی تحریکیں شروع کر دی گئیں۔ یہ وہشت پسند تحریکیں تھیں۔ ان کے ممبروں کے لئے داڑھی رکھنا لازمی تھا۔ انگریزوں نے مسلمانوں پر داڑھی رکھنے کی پابندی عائد کر دی جو مسلمان داڑھی رکھتا اُسے گرفتار کر لیا جاتا تھا۔

تمام سیتھ مجسٹریٹ انگریز اور چھوٹے افسر ہندو تھے۔ بنگال میں دفتری حساب کتاب اردو ہندسوں میں ہوتا تھا۔ اردو کی جگہ انگریزی اور بنگالی زبانیں رائج کر دی گئیں۔ مسلمانوں کی وہشت پسند تحریکوں نے سنگین صورت اختیار کر لی تو لارڈ کرزن کو گورنر جنرل بنا کر کلکتہ بھیجا گیا۔ وہ مسلمانوں کے لئے کچھ مراعات لے کر برطانیہ سے آیا۔ ہندوؤں نے ان مراعات کے خلاف وہشت پسند تحریکیں شروع کر دیں۔ ان میں کانگرس بھی شامل تھی جس کا سرغنہ سبھاش چندر بوس تھا اور ایک تحریک کا نام ”کاما گاما رو“ تھا جس کی کمان راش بھاری گوش کے ہاتھ تھی۔ اسے وہ جنگ آزادی کہتے تھے لیکن ہندوؤں کا اصل محاذ مسلمانوں کے خلاف تھا۔ ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مشرقی مسلم بنگال، اور مغربی بنگال۔ دار الحکومت کلکتہ کی بجائے دہلی منتقل کر دیا گیا۔

حکومت ہند کے ان فیصلوں کے خلاف ہندو تحریکوں نے شدت اختیار کر لی۔ انگریزوں نے ان تحریکوں کو دبانے کے لئے پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں کو اور یو۔ پی سے اُن چٹھانوں کو جو وہاں آباد تھے، ایک خصوصی پولیس فورس میں بھرتی کیا جس کا نام بنگال سپیشل پولیس تھا۔ انہی مسلمانوں

میں سے بہت سی نفزی کو برما بھیج کر برما پولیس بناتی اور ہانگ کانگ بھیج کر ہانگ کانگ سپیشل پولیس بناتی۔ بنگال سپیشل پولیس کو خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ میرے خالو، خان بہادر عبدالعزیز کو وہشت پسند گروہوں کی سرانجامی اور سرکوبی کے لئے کلکتہ بھیجا گیا۔ نادر خان، نادر شاہ اور زریں گل اسی پولیس فورس کے چنے ہوئے سرانجام اور نڈر کارندے تھے۔ انہیں خان بہادر عبدالعزیز کا معاون بنایا گیا۔

۱۹۱۱ء میں اس تحریک کے آدمیوں نے دہلی کے چاندنی چوک میں واتسراتے پر بم پھینکا۔ واتسراتے تو بچ گیا، اُس کے ساتھ جو شاف تھا اُس کا کوئی فرد زندہ نہ رہا۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ یہ بم راش بھاری گوش اور بنگلی نام کے ایک بنگالی نے پھینکا تھا۔ وہ پکڑے نہ جاسکے۔ یہ انکشاف بھی ہو کر یہ دونوں گروہ کے سرغنے ہیں۔ انگریزوں نے انہیں زندہ یا مردہ پکڑنے والے کے لئے انعامات کا اعلان کیا۔ راش بھاری گوش کے لئے پانچ لاکھ اور بنگلی کے لئے دو لاکھ روپیہ — یہ بھی معلوم ہو کر ان کے زمین دوز اڈے بنارس، مکھنہ، میرٹھ، دہلی، ڈیرہ دُون، امرتسر اور لاہور میں ہیں۔

خان بہادر عبدالعزیز نے سرانجامی شروع کر دی — نادر خان، نادر شاہ اور زریں گل ان کے معاون تھے۔ خان بہادر عبدالعزیز نے بنارس میں ساڈھو کے بہروپ میں اپنا اڈہ قائم کر لیا۔ ان کے تینوں معاون مختلف بہروپ میں سارے ہندوستان میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ وہشت پسند بھی بڑے ذہین اور جاسوسی کے ماہر تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ بنارس میں بیٹا ہوا ساڈھو، ساڈھو نمیں سپیشل پولیس کا ڈمی آتی جی ہے۔ چنانچہ خان بہادر پر حملہ ہوا اور وہشت پسند انہیں اس حال میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک گئے کہ وہ بظاہر مر چکے تھے۔ ان کی شہادت اچھی تھی، پنج ننگے — وہشت پسندوں نے ان کا بیچنا چھوڑا۔ لاہور میں بھی ان پر بم پھینکے گئے لیکن اللہ نے انہیں ہر بار بچا لیا۔

نادر خان، زریں گل اور نادر شاہ مختلف چھاؤنیوں میں سرانجامی

کرتے رہے۔ اطلاع ملی تھی کہ دہشت پسندوں نے فوجی سکھوں اور ہندوؤں کو اپنے ساتھ لانا شروع کر دیا ہے۔ میں یہ تفصیلات بتانے سے قاصر ہوں کہ نادر خان اور اس کے ساتھیوں نے میرٹھ چھاؤنی میں دہشت پسندوں کو جلال میں کس طرح بچانا سنا تھا۔ سنی سناتی یہ ہے کہ نادر خان دہشت پسندین کران سے مل گیا تھا اور حیدر کو دو سکھوں کے ساتھ رسالے کے بکھ سکو اڈرن کے ایک کمرے میں میٹنگ کے بہانے لے آیا تھا۔

جب حیدر کو پکڑا گیا تو انکشاف ہوا کہ وہ بنگلی ہے جس کی گرفتاری کے لئے انگریزوں نے دو لاکھ روپیہ انعام مقرر کر رکھا تھا۔ وہ مسلمان کے بہرہ میں حیدر نام رکھ کر میرٹھ کالج میں پڑھتا تھا۔ اس کی دہشت گردی کے تاثرات میرٹھ، دہلی، لاہور اور امرتسر میں تھے۔ اس کی گرفتاری کے صلے میں نادر خان کو ایک لاکھ روپیہ، زریں گل کو ستر ہزار روپیہ اور نادر شاہ کو تیس ہزار روپیہ انعام دیا گیا۔ اس کے علاوہ نادر خان کو جعفر زریں گل کو بھی جعفر اور نادر شاہ کو دفعہ اربنا کر فرانس بھیج دیا گیا۔ فرانس میں انہیں برطانوی کمانڈر انچیف کی سیکورٹی فورس میں لگا دیا گیا۔

دہشت پسندوں نے انتقام لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ۱۹۲۹ء میں میرا رسالہ کو ہاٹ گیا۔ ایک روز میں کوہاٹ سے پشاور جا رہا تھا۔ راستے میں پٹویری نام کا ایک گاؤں آیا تو مجھے زریں گل اور نادر شاہ یاد آ گئے۔ وہ اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد وہ فرانس سے واپس آ گئے تھے۔ میں نے اس گاؤں سے ان دونوں کے متعلق پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ فرانس سے واپس آتے تو چھٹی پر آ گئے۔ دونوں کے گھروں میں کسی نے ہم بھینکے اور دونوں مارے گئے۔

www.facebook.com/urdunovel

باغ علی خان مرحوم کے خاندان کے ایک اہم فرد خان مشتاق خاں کٹ راولپنڈی نے باغ علی خان کے ترکوں سے جاننے کے ذریعہ انگریز واقعہ میں یوں اضافہ کیا۔ باغ علی خان ایک گشتی باری کے کمانڈر تھے۔ جب یہ گشتی باری کی کے

لے بہت آگے نکل گئی تو اُس وقت باغ علی خان داتیں طرف تھے اور ان کے داتیں طرف ایک سکھ تھا۔ باغ علی خان کی نظر ویسے ہی داتیں طرف گئی تو انہیں بہت سے ترک دکھائی دیتے جو ایک پہاڑی کے پیچھے توپیں لگاتے بیٹھے تھے۔ ان دونوں ترکوں کے خلاف مسلمانوں کا لڑنا قابلِ نفرت تصور کیا جاتا تھا۔

باغ علی خان کے دل میں جذبہ اسلام نے جوش مارا۔ انہوں نے سکھ سے کہا کہ وہ داتیں طرف آجائے۔ وہ خود داتیں طرف ہو گئے۔ یہ گشتی دستہ آگے نکل گیا۔ انگریزوں کی فوج کو ان کے متعلق خبر نہ ہو سکی۔ باغ علی خان نے اچانک گھوڑے کو ایڑ لگاتی اور رُخ ترکوں کی طرف کر لیا اور ترکوں سے جا ملے۔ ترکوں کے توپخانے نے انگریزوں کے بریگیڈ پر گولہ باری کی اور ان کا بہت نقصان کیا۔ صاف ظاہر ہے کہ ترکوں نے باغ علی خان کی نشاندہی پر گولہ باری



نادر خان کی فرانسیسی بیوی سے سب سے بڑا لڑکا، جان نادر پاک فوج میں بریگیڈیئر ہیں۔ نادر خان کا دوسرا لڑکا ایوب نادر امریکہ میں شہرت یافتہ ڈاکٹر ہیں۔

۱۵-۱۹۱۴ء میں لاہور سازش کیس اور دہلی سازش کیس بہت مستہور ہوئے۔ ان میں بریگیڈیئر المعروف ولیپ سنگھ کا نام قابل ذکر ہے۔ جب بنگالی کو بم بناتے ہوئے اندر ہی انگریز آفیسر نے گرفتار کر لیا تو اُس وقت نادر خان اور زرین گل کو بھی ساتھ ہی گرفتار کر کے لے گئے اور مینوں کو جیل میں بند کر دیا پھر علیحدہ کر دیا گیا اور انگریزوں نے نادر خان اور زرین گل کو فرانس بھیج دیا کیونکہ ان کی جان کا سخت خطرہ تھا۔

بنگالی دہشت پسند نے آخری خواہش ظاہر کی کہ وہ اُس شخص کو دیکھنا چاہتا ہے جس نے اُسے گرفتار کر لیا ہے۔ چنانچہ نادر خان کو پیش کیا گیا مگر اُس نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ نادر خان وہی ہے جو اُس کے ساتھ مل کر بم بناتا تھا اور کہا کہ اُس کی تو بڑی بڑی موٹھیں تھیں، پشتو بولتا تھا۔ یہ کوئی انگریز ہے۔ جب نادر خان کو اُس کے سامنے پیش کیا گیا تو اُس وقت نادر خان بالکل انگریز معلوم ہو رہے تھے۔ موٹھیں بالکل صفا چٹ تھیں۔ داڑھی بالکل صاف۔ یہ اُن میں ایک خاص کمال تھا کہ جب بھیس بدلتے تو اُن کو پہچانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

www.facebook.com/urdu novels pdf

